مولانا مودودیؒ

کی

مختصر آپ بیتی

مدوّن

محمد یوسف بھٹّا

ترتیب

☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ہر انسان اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں گردو پیش کے حالات و واقعات اور موجود و غیر موجود شخصیتوں کے افکار و خیالات سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی زندگی کی شاہ راہوں کو متعین کرنے اور انھیں سازگار و آسودہ بنانے کے لیے ان کے فکر و نظر سے استفادہ کرتا ہے۔ اس میں بعض کے تاثرات وقتی ہوتے ہیں، جو بہت جلد زائل ہو جاتے ہیں اور بعض کے دائمی، جن کو زمانے کی گردشیں بھی نہیں مٹا سکتیں۔ لیکن یہ تاثرات ضرور ہوتے ہیں۔ چناں چہ میں بھی اپنی زندگی میں مختلف شخصیتوں کے افکار و خیالات سے متاثر ہوا اور ان کے فکر و عمل سے اپنی استعداد کے مطابق فیض حاصل کیا۔

میری زندگی کا یہ ایک یادگار واقعہ ہے کہ مجھ پر متکلمِ اسلام، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے افادات کا اثر ایسے نازک وقت میں ہوا جب کہ لادین تعلیمی ماحول اور مستشرقین کی کتابوں کے مطالعے کی وجہ سے اسلام کی ''ہیئت کلی'' مجھے بہت ہی ناپسندیدہ دکھائی دینے لگی تھی۔ خاص طور پر اسلام میں جہاد کی، جو گھناؤنی اور خوں آشام نقاشی اِن علم نوازانِ جہل کارنے کی ہے، اس سے طبیعت میں سخت خلجان پیدا ہوا تھا۔ اصل حقیقت کو جاننے کے لیے میں نے ایک جاں بلب پیاسے کی طرح اردو و انگریزی میں اہلِ علم مسلمانوں کی ہر اس تحریر کو پڑھ ڈالا، جس تک میری رسائی ہو سکی۔ لیکن کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے کسی کی تحریر بھی میرے خلجان کو رفع نہ کر سکی اور نہ اس سیاہ کاری کا مداوا کر سکی، جس سے مشرق شناسانِ غرب نے اسلام کو داغ دار کرنے کی مشئوم کوشش کی تھی۔

۱۹۳۵ کا زمانہ تھا اور ایسے نازک موقعے پر جب کہ میں کفر والحاد کے چھپے میں گرنے ہی والا تھا کہ میرے ایک دوست نے مجھے مولانا مودودیؒ کی غالباً اوّلین تصنیف 'الجہاد فی الاسلام' کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ اس کے مطالعے نے میرے فکر و تصور کا نقشہ ہی بدل دیا۔ میں تو اسے تائید ایزدی سمجھتا ہوں اور اسی لیے مولانا مودودیؒ سے زیادہ اس ذاتِ پاک کا شکر گزار ہوں، جس نے مجھے اسلام پر استقامت بخشی اور مولانا مودودیؒ کو بے راہوں کو راہ پر لانے کی قابلیت عطا کی۔ اس وقت سے آج تک میں مولاناؒ کی تحریروں کو باقاعدہ پڑھتا رہا ہوں اور امکان بھر ان کو سمجھنے اور ان سے استفادہ کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ان کے ایک ایک لفظ کو سمجھا ہے اور ان کے پیغام کی روح کو پالیا ہے، البتہ یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ اُن کی تحریروں نے مجھے اسلام سے روشناس کرایا اور خدا کی اس بے پایاں نعمت کو اپنانے کی خواہش میرے دل میں پیدا کی، جو بحمد اللہ زندۂ جاوید ہے۔ لیکن اب تک مولانا سے ملنے کا اتفاق نہیں پیش آیا تھا اور نہ اس کی دل میں اس کی خواہش پیدا ہوئی، نہ جانے کیوں؟ شاید اس لیے کہ ع

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

مولانا مودودیؒ کے اصول و نظریات سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف، لیکن یہ ہر شخص تسلیم کرے گا کہ وہ اپنے عہد کی ایک بڑی شخصیت ہیں اور ان کے اعمال و افکار میں ہمیں ایسے بے شمار نقوش مل سکتے ہیں، جو اُن کے بڑے پن کو ظاہر کرتے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، مولانا مودودیؒ کی شخصیت کا مقام معلوم کرنے کے لیے ایک میزان کا کام دے گی۔

محمد یوسف

میرا بچپن

میرا بچپن ریاست حیدر آباد کے مشہور شہر اورنگ آباد دکن میں گزرا ہے۔ میرا خاندان تو دہلی کا تھا، لیکن میرے والد مرحوم دہلی سے اورنگ آباد دکن چلے گئے تھے۔ اس وجہ سے میری زندگی کے ابتدائی تیرہ چودہ سال اورنگ آباد میں ہی بسر ہوئے۔ جو لوگ ایک ہی جگہ پل کر جوان ہوئے ہیں اور ساری عمر اپنے پیدائشی وطن میں ہی رہے ہیں، وہ اس بات کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی گہری محبت ہوتی ہے، جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا ہو۔

تیرہ چودہ سال کی عمر تک میں وہیں رہا۔ پھر میرا یہ پیدائشی وطن مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ برسوں کے بعد جوانی کی عمر میں جب مجھے ایک دفعہ پھر اورنگ آباد جانے کا اتفاق ہوا تو میرے اوپر عجیب کیفیت گزری۔ جوں جوں شہر قریب آتا جاتا تھا، میری بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ریل بہت سست چل رہی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ریل پر سے کود جاؤں اور بھاگ کر شہر میں جا پہنچوں۔ بچپن کی دیکھی ہوئی ہر ایک چیز کو میں پہچاننے کی کوشش کرتا تھا اور میرا دل بے اختیار کھنچنے لگتا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی گہری محبت ہوتی ہے، جہاں اس کا بچپن گزرا ہو۔

ایک عجیب بات، جو میں نے وہاں جا کر محسوس کی وہ یہ تھی کہ بچپن کی دیکھی ہوئی کوئی چیز بھی اب اتنی بڑی نہیں تھی، جتنی چند سال پہلے تھی۔ سڑکیں، بازار، گلیاں، عمارتیں، سب پہلے سے چھوٹی اور کچھ کچھ تنگ سی ہو گئی تھیں، جن گھروں میں کبھی رہا تھا یا اکثر جایا کرتا تھا، وہ بھی پہلے بڑے بڑے تھے اور اب سکڑ کر بالکل چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ جس چیز کو بھی اپنی یاد کے نقشے سے ملا کر دیکھتا ہوں وہ ہے تو اپنی جگہ ہی پر، مگر پہلے سے چھوٹی ہو کر رہ گئی ہے۔

آخر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سارا فرق، جو مجھے محسوس ہو رہا ہے، دراصل ان چیزوں میں نہیں ہوا، بلکہ خود میرے اندر ہو گیا ہے۔ جب تک میں بچہ تھا، میری نگاہ چھوٹی تھی اور چیزیں بڑی نظر آتی تھیں۔ جب میں بڑا ہو گیا، تو میری نگاہ بھی بڑی ہو گئی اور چیزیں اُسی لحاظ سے چھوٹی نظر آنے لگیں۔

مجھے اپنی بہت چھوٹی عمر کی باتیں بھی اب تک یاد ہیں، مجھے اپنی حیرت اب تک یاد ہے، جو مجھے پہلی مرتبہ یہ سن کر ہوئی تھی کہ ابا کے ابا کو دادا اور ابا کی اماں کو دادی کہتے ہیں۔ میرا دل یہ یقین کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا کہ ابا بھی کسی کے بیٹے ہو سکتے ہیں اور نہ میں یہ تصور ہی کر سکتا تھا کہ میرے والد بھی کبھی میری طرح بچے ہوں گے۔ اس نئی معلومات پر میں بہت دنوں تک غور کرتا رہا اور یہ بات بڑی تحقیقات کے بعد میری سمجھ میں آئی کہ جتنے لوگ اب بوڑھے ہیں، یہ سب کبھی بچے تھے اور اُن کے بھی کوئی ماں باپ تھے۔

اس سے بھی زیادہ چھوٹی عمر کا ایک اور خیال مجھے اب تک یاد ہے کہ میں اماں اور ابا کے کوئی معنی نہیں جانتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور میں ان کے پاس کیسے آ گیا ہوں، البتہ میں یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ یہ ہیں بڑے اچھے لوگ۔ اپنے والد کو دنیا کا سب سے اچھا آدمی اور اپنی والدہ کو سب سے اچھی عورت سمجھتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ لطف اس وقت آتا تھا، جب میں بیمار ہوتا، یا مجھے کوئی چوٹ لگ جاتی تھی اور میرے والدین میرے لیے پریشان ہوتے تھے۔ اسی لطف کی خاطر میں اپنے آپ کو کبھی کبھی جان بوجھ کر بھی خطرے میں ڈالتا تھا۔ اس وقت جو بے چینی میری والدہ اور میرے والد کے دل میں پیدا ہوتی تھی، اس سے میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ اُنھیں میری بہت فکر ہے۔ ان تجربات سے ماں اور باپ کے معنی میری سمجھ میں آئے اور مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ماں اور باپ اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرے ایک بھائی مجھ سے تین چار سال بڑے تھے۔ مجھے کھانے کی جو چیز ملتی تھی، اُسے فوراً کھا لیتا تھا، مگر بھائی صاحب سنبھال کر کسی وقتِ مناسب پر کھانے کے لیے اٹھا رکھتے تھے۔ اسی طرح جو پیسے مجھے ملتے تھے اُن کو بھی فوراً خرچ کر ڈالتا تھا اور بھائی انھیں جمع کر کے کبھی کوئی اچھی چیز خرید لاتے تھے۔ بس یہ میرے اور ان کے درمیان جھگڑے کی بنیاد تھی۔ میں ہمیشہ ان کے حصے میں سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتا تھا

اور وہ ہمیشہ تھوڑی دیر تک مقابلہ کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اول تو میں سمجھا کرتا تھا کہ اس طرح میں انھیں شکست دے کر مالِ غنیمت حاصل کرتا ہوں، مگر بعد میں مجھے معلوم ہو گیا کہ بڑے بھائی کو مجھ سے محبت ہے اور انھیں خود بھی اسی میں مزہ آتا ہے کہ میں ان سے لڑ بھڑ کر اپنا حصہ وصول کر لیا کروں۔ اس طرح میں والدین کے عطیوں میں سے ۷۵ فیصدی کا مالک ہوتا تھا۔ پچاس فیصد اپنے حساب میں اور پچیس فیصد بڑے بھائی کے حساب میں سے۔ مشہور بات تو یہ ہے کہ ''سگ باش برادرِ خورد مباش'' یعنی چھوٹا بھائی بننے سے کتا بننا زیادہ بہتر ہے، مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔

میرے والد مرحوم نے میری تربیت بڑے اچھے طریقے سے کی تھی۔ وہ دہلی کے شرفا کی نہایت ستھری زبان بولتے تھے۔ انھوں نے ابتدا سے یہ خیال رکھا تھا کہ میری زبان بگڑنے نہ پائے۔ جب کبھی میری زبان پر کوئی غلط لفظ چڑھ جاتا یا کوئی بازاری لفظ میں سیکھ لیتا، تو وہ مجھے ٹوک دیتے اور صحیح بولنے کی عادت ڈالتے۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں پرورش پانے کے باوجود میری زبان محفوظ رہی۔ بعد میں مجھے ہندستان کے مختلف حصوں میں برسوں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، مگر بچپن، میں جو زبان پختہ ہو چکی تھی اُس پر کسی جگہ کی بولی کا اثر نہ پڑ سکا۔ وہ راتوں کو مجھے پیغمبروں کے قصے، تاریخِ اسلام اور تاریخِ ہندستان کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اس کا مفید اثر میں آج تک محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرے اخلاق کی درستی کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے مجھے ایسے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیا، جن کی عادتیں بگڑی ہوئی ہوں۔ جب کبھی میں کوئی بری عادت سیکھ لیتا تھا، تو بڑی کوشش سے اسے چھڑاتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ملازمہ کے بچے کو مارا تو انھوں نے اس بچے کو بلا کر کہا ''تو بھی اُسے مار۔'' اس سے مجھے ایسا سبق ملا کہ پھر تمام عمر میرا ہاتھ کسی زیرِ دست پر نہیں اٹھا۔ وہ مجھے زیادہ تر اپنے ساتھ اپنے دوستوں کی صحبت میں لے جاتے تھے اور ان کے دوست سب کے سب سنجیدہ، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کی وجہ سے میں مہذب عادات سیکھ گیا اور بڑی بڑی باتوں کو سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ میری طبیعت میں جتنی شوخی تھی، والد مرحوم کی اس تربیت کی وجہ سے وہ شرارتوں اور دنگے فساد کے بجائے ظرافت کی شکل میں ڈھل گئی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں مجھ

سے بڑی عمر کے لوگ میرے ساتھ بہت دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیوں کہ میں شرارتیں کرنے کے بجائے بہت مزے مزے کی باتیں کیا کرتا تھا۔

میرے والد مرحوم نے میری ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا تھا۔ غالباً وہ میری زبان کی حفاظت کے لیے اور مجھے بری صحبتوں سے بچانے کے لیے مجھے مدرسے بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ گھر کی اس تعلیم میں مجھ کو بہت سے استادوں سے سابقہ پڑا۔ بعض استاد ایسے تھے، جنھوں نے مجھے کند ذہن بنانے کی کوشش کی اور اُن کے اثر سے مجھے خود اپنے اوپر ہی یہ شک ہونے لگا کہ شاید میں کچھ پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض استادوں نے مجھے اس سے زیادہ پڑھانے کی کوشش کی، جتنا میں اپنی عمر کے لحاظ سے پڑھ سکتا تھا، البتہ بعض استادوں نے مجھے بہت اچھی تعلیم دی اور مجھے جو کچھ حاصل ہوا وہ اُنھی کا فیض تھا۔ مجموعی طور پر اسے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ گھر کی یہ تعلیم میرے لیے مدرسے کی بہ نسبت زیادہ مفید ثابت ہوئی اور پانچ سال کی اس تعلیم میں مجھ کو اتنا علم حاصل ہو گیا جتنا دوسرے بچوں کو آٹھ سال میں ہوتا ہے، بلکہ جب مجھ کو گیارہ سال کی عمر میں مدرسے کی آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا، تو اکثر مضمونوں میں میری معلومات اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ تھیں، حالاں کہ میں اپنی آٹھویں کلاس میں سب سے چھوٹی عمر کا طالب علم تھا۔

میری ابتدائی تعلیم میں ایک خرابی ایسی تھی، جس کو بعد میں میں نے بری طرح محسوس کیا۔ وہ خرابی یہ تھی کہ عام دستور کے مطابق مجھے سب سے پہلے بغدادی قاعدہ پڑھوا کر قرآن شریف پڑھوا دیا گیا۔ یہ غلطی عام طور پر مسلمان اس زمانے میں بھی کرتے تھے اور آج تک کیے جا رہے ہیں۔ اس کا یہ نقصان ہے کہ بچہ دنیا کی اور ساری چیزیں تو سمجھ کر پڑھتا ہے، مگر صرف قرآن ہی کے متعلق وہ خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے، جسے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس کے الفاظ پڑھ لینے کافی ہیں۔ اس غلط طریقے کی وجہ سے مجھے بے سمجھے قرآن پڑھنے کی ایسی عادت پڑی کہ آگے چل کر جب میں نے عربی زبان پڑھ لی، اس وقت بھی برسوں تک قرآن پاک کو بغیر سمجھے ہی پڑھتا رہا۔ اکیس سال کی عمر میں مجھ کو پہلی مرتبہ اپنی اس غلطی کا احساس ہوا اور میں نے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب مسلمان بچوں کو اس غلطی سے بچایا جائے اور

اُنھیں قرآن اس وقت پڑھایا جائے، جب وہ کم از کم اتنی اردو پڑھ لیں کہ قرآن کا ترجمہ ساتھ ساتھ پڑھ سکیں۔

اب میں تھوڑا سا حال اپنے مدرسے کا بیان کرتا ہوں۔ گیارہ برس کی عمر میں جب مجھ کو ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا اُس وقت مجھے پہلی مرتبہ اپنے ہم جماعت لڑکوں سے میل جول کا موقع ملا۔ کیوں کہ اس سے پہلے تک تو میں زیادہ تر بڑوں کی صحبت ہی میں رہا تھا۔ مدرسے میں اول اول تھوڑے دنوں تک اجنبی رہا پھر میں نے مدرسے کی اس ٹولی سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے، جس میں سنجیدہ اور شوقین طالب علم شامل تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے محض اپنی ظرافت کے ذریعے سے شریر ٹولی کے بھی دو تین سرغنوں کو دوست بنا لیا تھا۔ میں ان کی شرارتوں میں تو شریک نہیں ہوتا تھا، مگر مذاق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے میں نے ان کو رام کر لیا تھا۔ اس طرح میں شریف ٹولی کا دوست بھی رہا اور شریر ٹولی سے میرے تعلقات بھی نہ بگڑے۔ استادوں میں سے اکثر میرے اوپر مہربان تھے۔ خصوصاً ایک استاد تو ایسے شفیق بن گئے کہ آج تک ان کے خاندان سے میرے تعلقات قائم ہیں اور ان کے صاحب زادے کو میں اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ مدرسے میں ہی مجھ کو پہلی مرتبہ مضامین لکھنے اور تقریری مباحثوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ اس سے مجھ کو احساس ہوا کہ مجھ میں زبان اور قلم سے کام لینے کی کچھ صلاحیت ہے۔ مدرسے کی زندگی میں چند ماہ ہی گزارنے کے بعد مجھے اس سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ چھٹی کا دن مجھ کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ اور جب لمبی چھٹیاں آتی تھیں، تو پہلے ہی سے ہم چند لڑکے آپس میں یہ پروگرام طے کر لیتے تھے کہ روزانہ ایک جگہ جمع ہوا کریں گے اور مل کر کچھ مطالعہ کیا کریں گے اور مل کر تفریح بھی کریں گے۔

کھیل سے مجھے ابتدائی عمر میں بہت کم دلچسپی تھی، جب کچھ ہوش سنبھالا تو بنوٹ کے فن سے کچھ دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میری والدہ صاحبہ کے خاندان میں یہ فن بہت مقبول تھا۔ خصوصاً میرے ماموں اس کے بہت ماہر تھے۔ میں نے اپنے خالہ زاد بھائیوں سے یہ فن سیکھا اور کچھ مدت تک بس یہی میرا کھیل رہا۔ مدرسے میں داخل ہونے کے بعد مجھے فٹ بال اور کرکٹ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ مگر صرف تفریح کے لیے اس میں شریک ہوتا تھا، لیکن اچھا کھلاڑی میں کبھی نہیں بن سکا۔

خودنوشت

”یہ خودنوشت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۱۹۳۲ میں اپنے ایک دوست سید منظر علی اشہر مولف ”منظر الکرام“ کی فرمائش پر رقم فرمائی تھی۔ منظر صاحب نے ”منظر الکرام“ کے نام سے عمائد اور مشاہیر حیدر آباد (دکن) کا ایک تذکرہ لکھ کر شائع کیا تھا، اسی سلسلے میں ان کو صاحبانِ علم و قلم کا تذکرۂ خودنوشت مرتب کرنے کی نادر ترکیب سوجھی، اس ترکیب سے یہ رواں اور بے تکلف نوشتہ معرضِ وجود میں آیا اور یہ حسنِ اتفاق ہے کہ مرتبِ اوراق کو ان اوراق کی ترکیب کے لیے مولانا ابوالخیر مودودیؒ کے ذریعے خود منظر صاحب کا منقولہ نسخہ حاصل ہوگیا۔ اس پس منظر کے لحاظ سے یہ ایک تاریخی چیز ہے، لیکن اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، اس میں اک اساس ہے سیرت و شخصیت کی اور وہ شئون ہیں، جن میں فکر و نظر کی تکوین ہوتی ہے۔“

خاندان کا تعارف

میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے، جس میں تیرہ سو برس تک سلسلۂ ارشاد و ہدایت اور فقر و درویشی جاری رہا ہے۔ ساداتِ اہلِ بیت کی ایک شاخ تیسری صدی ہجری میں ”ہرات“ کے قریب ایک مقام پر آ کر آباد ہوئی تھی، جو ”چشت“ کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہوا۔ اس خاندان کے نامور بزرگ حضرت ابو احمد ابدال چشتیؒ (متوفی ۳۵۵ھ) حضرت حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسنؓ کی اولاد سے تھے۔ انھی سے صوفیۂ کرام کا مشہور سلسلہ چشتیہ جاری ہوا ہے۔ ان کے نواسے اور جانشین حضرت ناصر الدین ابو یوسف چشتی (متوفی ۴۵۹ھ) سادات کی ایک دوسری شاخ سے تعلق رکھتے تھے، جس کا سلسلۂ نسب امام علی نقیؒ کے واسطے سے حضرت امام حسینؓ

تک پہنچتا ہے۔ حضرت ناصر الدین ابو یوسفؒ کے فرزند اکبر حضرت خواجہ قطب الدین مودودی چشتی (متوفی ۵۲۷ھ) تھے، جو تمام سلاسلِ چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندانِ مودودیہ کے مورثِ ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے شیخ حضرت عثمان ہارونیؒ تھے۔ اُن کے شیخ حضرت جامی شریف زندانیؒ اور ان کے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین مودود، اس طرح حضرت خواجہ مودود حضرت اجمیری کے دادا پیر تھے۔

خاندانِ مودودیہ کی، جس شاخ سے میرا تعلق ہے وہ نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہندستان میں آباد ہے۔ اس شاخ کے پہلے بزرگ، جنھوں نے ہندستان میں مستقل سکونت اختیار کی حضرت ابوالاعلیٰ مودودیؒ (متوفی ۹۳۵ھ) تھے۔ وہ سکندر لودھی کے زمانے میں چشت سے ہندستان آئے اور کرنال کے قریب قصبہ براس میں مقیم ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے میں یہ خاندان مستقلاً دہلی میں آباد ہوا اور اب تک کہ پانچ پشتیں گزر چکی ہیں اور چھٹی پشت گزر رہی ہے، اسی اُجڑے دیار میں آباد ہے۔

ننھیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں۔ میرے نانا مرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ، گو خود شاعر اور صاحب قلم تھے، مگر پشت ہا پشت سے اُن کا پیشۂ آبا سپہ گری تھا۔ ان کے بزرگوں میں سے مرزا طولک بے عالمگیر کے عہد میں ماوراء النہر سے ہندستان آئے اور فوجی مناصب سے سرفراز ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح شاہی خدمت بجالاتے رہے۔ جب شیرازۂ سلطنت درہم برہم ہوا تو مختلف افراد مختلف سمتوں میں تتر بتر ہو گئے، چناں چہ حضرت سالک مرحوم کے والد، نواب عالم بیگ خاں اور چچا نواب نیاز بہادر، نواب میر نظام علی خان کے آخری عہد میں حیدر آباد آئے۔ نیاز بہادر خان کی شادی نواب مستقل جنگ عزت الدولہ عاشور بیگ خاں کی صاحب زادی سے ہوئی۔ یہ عاشور بیگ خاں اُن کے ہم جد اور رشتے میں ان کے چچا تھے اور دولت آصفیہ نے اسی خطاب و اعزاز سے سرفراز کیا تھا، جو خطاب و اعزاز دولتِ مغلیہ کی جانب سے ان کے جد کو عطا کیا گیا تھا۔ نواب مستقل جنگ کے بعد نیاز بہادر خاں ان کی جگہ نظمِ جمعیت کے جمعدار اور جاگیر کے مالک ہوئے۔

عالم بیگ خاں کی شادی عبد الرحیم خاں، قلعہ دار گول کنڈہ کے خاندان میں ہوئی اور

انھی بیوی کے بطن سے حضرت سالکؔ مرحوم پیدا ہوئے۔ ۱۸۲۲ میں نواب نیاز بہادر خاں چنچل گوڑہ کے ہنگامے میں شہید ہوئے۔ اس ہنگامے کے واقعات دکن کی تاریخوں میں تفصیل سے مذکور ہیں اور شہادت کا یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ''از شمشیرِ شمشیر خان کارِ نیاز بہادر خاں، واز شمشیرِ نیاز بہادر خاں کارِ شمشیر خاں تمام شد۔'' اس واقعے کے بعد نواب عالم بیگ خاں اپنے خورد سال بچے کو لے کر دہلی واپس چلے گئے۔ اس کے تقریباً چالیس برس بعد مرزا سالک مرحوم پھر حیدر آباد واپس آئے اور سر سالار جنگ اعظم نے اُن کو سر رشتۂ تعلیمات میں مامور کر دیا۔ یہاں انھوں نے نواب عماد الملک بلگرامی کی سر پرستی و شرکت سے ''مخزن الفوائد'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا، جو اگر چہ حیدر آباد کا سب سے پہلا نہیں تو کم از کم قدیم ترین علمی وادبی رسالوں میں سے ایک ضرور تھا۔ ۱۸۵۴ میں حضرت سالک نے انتقال فرمایا اور اُسی خاک میں دفن ہوئے، جہاں پیدا ہوئے تھے۔

میرے والد مرحوم، مولوی سید احمد حسنؒ ۱۸۵۷ کے ہنگامے سے دو سال پہلے دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دور کے طالب علموں میں سے تھے۔ سر سید مرحوم نے جب مدرسۃ العلوم قائم کیا تھا تو وہ اپنے خاندان اور رشتے داروں میں سے بھی بہت سے لڑکوں کو چن کر علی گڑھ لے گئے تھے۔ چوں کہ میری دادی صاحبہ مرحومہ سے اُن کی قرابت ہوتی تھی، اس لیے میرے والد مرحوم کا انتخاب بھی اسی سلسلے میں ہوا۔ مدرسہ میں سر محمد رفیق اور سر بلند جنگ وغیرہ ان کے رفیقِ جماعت تھے، اُس زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں جو شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی اس کا حال سب جانتے تھے، مگر ہمارا خاندان اس نفرت میں عام مسلمانوں سے بھی کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ کیوں کہ یہاں مذہب کے ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی۔ میرے دادا صاحب کو والد صاحب کا علی گڑھ میں تعلیم پانا سخت نا گوار تھا، مگر سر سید کے خیال سے خاموش تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے ایک عزیز علی گڑھ تشریف لے گئے اور اتفاقاً ایک جگہ کرکٹ کا کھیل دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں ان کی نظر والد مرحوم پر پڑی، اور یہ دیکھ کر انھیں سخت رنج ہوا کہ پیر طریقت کا لڑکا انگریزی لباس پہنے انگریزی طرز کا کھیل کھیل رہا ہے۔ دہلی واپس ہوئے تو دادا صاحب سے مل کر کہا:

''بھائی صاحب! احمد حسن سے تو ہاتھ دھو لیجیے۔ میں نے اس کو علی گڑھ میں
دیکھا کہ کافر کرتی پہنے گیند بلا کھیل رہا تھا۔''

یہ خبر سن کر دادا صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے فوراً والد مرحوم کو علی گڑھ سے واپس بلا لیا۔ اس طرح وہاں تکمیلِ تعلیم نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے الٰہ آباد جا کر وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ریاست دیوگڑھ میں ولی عہد کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اتالیقی کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ راجہ صاحب نے دہلی سے دو آدمیوں کو بلایا تھا تاکہ ان میں سے ایک کا انتخاب کریں۔ ان میں سے ایک میرے والد تھے اور ایک والد صاحب مرحوم کے استاد تھے، جنھوں نے بچپن میں ان کو پڑھایا تھا۔ دیوگڑھ پہنچ کر جب والد مرحوم کو معلوم ہوا کہ میرے اُستاد کو بھی بلایا گیا ہے، تو انھوں نے راجہ صاحب سے کہلا بھیجا کہ میں اپنے استاد کے مقابلے میں پیش نہیں ہو سکتا، مجھے واپسی کی اجازت دی جائے۔ دوسری طرف استاد صاحب سے والد صاحب کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا: ''وہ میرا شاگرد اور میرے سامنے کا بچہ ہے۔ بھلا وہ میرے مقابلے میں کیا پڑھائے گا۔'' دونوں کے اخلاق کے یہ نمونے دیکھ کر راجہ صاحب نے کہا: ''ہمیں استاد کی ضرورت نہیں، شاگرد ہی ہمیں پسند آیا ہے۔'' کئی سال تک والد مرحوم دیوگڑھ میں رہے۔ پھر ایک سازش کے تحت ولی عہد کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا، جس کا والد مرحوم کو سخت صدمہ ہوا اور وہ دیوگڑھ کی ملازمت چھوڑ کر چلے آئے۔ پھر کئی سال تک اُنھوں نے میرٹھ، غازی آباد اور بلند شہر وغیرہ مقامات میں وکالت کی۔ اس کے بعد ۱۸۹۶ میں ایک مقدمہ میں وکالتاً اورنگ آباد دکن تشریف لائے۔ یہاں مولوی محی الدین خاں صاحب صوبے کے میرِ عدل تھے اور رشتے میں والد مرحوم کے چچا ہوتے تھے۔ اُن کے ایماء سے یہاں وکالت شروع کر دی اور چند ہی ماہ میں بڑی تیزی سے کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے تک والد صاحب پر انگریزی خیالات اور انگریزی طرزِ معاشرت کا غلبہ تھا اور مذہبیت کی چنگاری راکھ میں دبی ہوئی تھی۔ مولوی محی الدین خاں صاحب کی صحبت نے رفتہ رفتہ ان پر ایسا اثر کیا کہ فرنگیت کے تمام اثرات باطل ہو گئے اور اس کی جگہ اسلامیت پوری طرح متمکن ہو گئی۔ ۱۳۱۸ ہجری/ ۱۹۰۰ میں والد مرحوم نے مولوی محی الدین خاں صاحب سے بیعت کر لی اور ذکر و شغل، ریاضات و مجاہدات اور سلوک و مراقبہ میں لگ گئے،

تاہم اس وقت یہ رنگ اتنا نہ چڑھا تھا کہ وکالت کے ساتھ اس کا نباہنا مشکل ہوتا۔ چار سال تک دین اور دنیا دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مگر ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ میں، جب کہ میں صرف ایک سال کا تھا، والد مرحوم کے لیے ان دونوں کا نباہنا مشکل ہوگیا اور انھوں نے نہ صرف وکالت بلکہ دنیا کمانے کی فکر ہی کو خیر باد کہہ دیا، بلکہ تمام اثاث البیت تقسیم کر کے دہلی تشریف لے گئے اور درگاہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ایک قدیم بستی ''عرب سرائے'' میں اقامت گزیں ہوگئے اور اپنا سارا وقت دینی مشاغل میں صرف کرنے لگے۔ جب تین سال اسی طرح زندگی بسر کرتے گزر گئے، تو مولوی محی الدین خاں صاحب نے اُن کو پھر اورنگ آباد طلب کیا اور نصیحت کی کہ رجوع الی اللہ کے لیے ترکِ دُنیا لازم نہیں ہے۔ صرف یہ کوشش کرو کہ جو کچھ کماؤ جائز طریقے سے کماؤ۔ اس نصیحت پر عمل کر کے والد مرحوم نے پھر وکالت شروع کی، مگر اب یہ رنگ تھا کہ کوئی جھوٹا مقدمہ نہیں لیتے تھے۔ ہر مؤکل کو سب سے پہلے خود ان کی تحقیقات اور جرح و تنقید کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا، جب اُنھیں کامل اعتماد و اطمینان ہو جاتا کہ اس کا معاملہ سچا ہے تب کہیں اس کی وکالت کرنے پر راضی ہوتے۔ ان تصورات کے ساتھ وکالت کا چلنا معلوم! رفتہ رفتہ اہل معاملہ کا رجوع ان کی طرف کم ہوتا چلا گیا اور مالی مشکلات بڑھتی چلی گئیں، مگر اس کے ساتھ ان کا مذہبی رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی ذہنیت، ان کے خیالات، ان کی معاشرت غرض ہر چیز اس حد تک بدل گئی کہ یہ شبہ تک کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ ان کو کبھی انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کی ہوا بھی لگی ہے۔ 1915 تک اورنگ آباد میں وکالت کرتے رہے، پھر حیدر آباد تشریف لائے، مگر چند ماہ رہ کر خرابی صحت کے باعث بھوپال چلے گئے۔ جہاں میرے بڑے بھائی ایگزیکٹیو افسر تھے۔ وہاں ان پر فالج کا حملہ ہوا، جس نے ان کو بالکل بے کار کر دیا اور چار سال تک اسی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۹۲۰ میں انھوں نے انتقال فرمایا۔

پیدائش اور بچپن

میں ۳ر رجب ۱۳۲۱ھ (ستمبر ۱۹۰۳) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے تین چار سال قبل ایک بزرگ والد مرحوم کے پاس آئے تھے۔ انھوں نے میری پیدائش کی

پیش گوئی کی تھی اور والد صاحب مرحوم سے فرمایا تھا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ چوں کہ اس نام کے پہلے بھی ایک بزرگ ہمارے خاندان میں گزر چکے تھے اور انھی کی ذات سے ہندستان میں ہمارے خاندان کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اس لیے والد صاحب نے اُن کے ارشاد کو قبول کیا اور یاد رکھا، چناں چہ جب میں پیدا ہوا تو اسی نام سے مجھے موسوم کیا گیا۔ میری پیدائش کے ایک سال بعد، جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں والد مرحوم نے دنیا ترک کر دی اور تین سال تک درویشانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کے بعد گو انھوں نے دنیا کی طرف رجوع کیا، مگر اُس دنیا کی طرف نہیں جسے چھوڑا تھا، بلکہ ایک خالص مذہبی دنیا کی طرف۔ ان کی زندگی کے اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا، وہ ایک مکمل مذہبی ماحول تھا۔ والد مرحوم اور والدہ ماجدہ دونوں کی زندگی ایک ہی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی اس تربیت اور عملی نمونے کا یہ اثر تھا کہ ابتدا ہی سے میرے دل و دماغ پر مذہب کے گہرے نقوش مرتسم ہو گئے۔

تعلیم و تربیت

والد مرحوم نے اول دن ہی تہیّا فرما لیا تھا کہ مجھے مولوی بنائیں گے، چناں چہ میری تعلیم بھی اسی ڈھنگ سے ہوئی۔ اردو اور فارسی کے ساتھ عربی زبان اور فقہ و حدیث کے درس پر ڈال دیا گیا اور انگریزی زبان، علوم اور خیالات کی ہوا تک نہ لگنے دی گئی۔ والد مرحوم کو تعلیم کے ساتھ اخلاق و عادات کی اصلاح کا بھی خاص خیال تھا۔ ایک مدت تک اُنھوں نے مجھے کسی مدرسے میں داخل نہیں کیا تھا، بلکہ گھر پر تعلیم دلوائی۔ پڑھنے کے علاوہ جتنے اوقات بچتے تھے۔ ان میں وہ بیشتر مجھ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے احباب میں لے جاتے تھے، جو سب کے سب ثقہ اور سنجیدہ لوگ تھے۔ راتوں کو انبیاء کے قصے، بزرگانِ دین کے حالات، اسلامی تاریخ کی کہانیاں سناتے، مختلف دلچسپ پیرایوں میں اسلامی عقائد ذہن نشیں کراتے اور مذہبی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عام نشست و برخاست میں بھی انھیں اخلاق و تہذیب کی اصلاح کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ زبان کی طرف بھی ان کی خاص توجہ تھی۔ بیس سال تک دکن میں رہنے کے باوجود

ان کی زبان پر یہاں کا ایک لفظ اور ایک محاورہ بھی نہ چڑھا تھا، خالص اردوئے معلٰی بولتے تھے اور زبان کی حفاظت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس وجہ سے بھی انھوں نے ایک کافی مدت تک اس کا خیال رکھا کہ ہم عام بچوں میں ملنے جلنے نہ پائیں اور اس حفاظت کے باوجود اگر کبھی گھر کے نوکروں یا دوسرے لوگوں سے سنا سنایا کوئی دکنی لفظ یا محاورہ زبان پر چڑھ جاتا تو وہ فوراً ٹوک دیتے تھے اور صحیح لفظ بتادیا کرتے تھے۔

نو سال کی عمر تک میں نے گھر پر پڑھا اور اس زمانے میں صرف ونحو، عربی ادب اور فقہ کی متعدد ابتدائی کتابیں پڑھ لیں۔ پھر میرے استاد مولوی ندیم اللہ حسینی مرحوم ومغفور کے مشورے سے مجھے مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعت رُشدیہ میں داخل کر دیا گیا۔ داخلے کے چند ماہ بعد میں رشدیہ کے امتحان میں شریک ہوا، مگر ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ریاضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ریاضی کی تعلیم بھی میں نے اِسی چھ ماہ کی مدت میں حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ کسی اور مضمون میں میں کمزور نہ تھا، اس وجہ سے صدر مدرس ملّا داؤد صاحب نے، جو ابتدا سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے، میری ناکامی کے باوجود مجھے جماعت مولوی میں شریک کرلیا۔ یہاں پہلی مرتبہ میں جدید علوم سے روشناس ہوا، گو ذریعۂ تعلیم اُردو تھی، مگر کیمیا، طبیعات، ریاضی اور تاریخ وغیرہ علوم سے واقفیت اور دلچسپی کی ابتدا ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی مختلف اساتذہ کے اثرات سے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور مدرسے کے دوستوں کے ساتھ میل جول نے اس رُکھائی اور اَکل کھرے پن کو دور کر دیا، جو ابتداءً سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے کی بدولت پیدا ہوگئی تھی، مگر اتنے دنوں الگ رہنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں سوسائٹی میں اس وقت شامل ہوا، جب کافی ہوشیار ہو چکا تھا اور ان کی ابتدائی تربیت نے ایک ایسی سیرت کی بنیادیں مضبوط کردی تھیں، جو دوسروں کے اثرات کو بلا امتیاز اور بلا ارادہ قبول نہ کرسکتی تھی۔ اس کا فائدہ مجھے چند سال بعد محسوس ہوا، جب میں اپنی زندگی میں کلیتاً آزاد و خود مختار ہوگیا اور کوئی دوسرا نگرانی کرنے والا نہ رہا۔ اس وقت صرف یہی چیز تھی، جس نے مجھ کو گم راہ ہونے سے بچالیا۔ حالاں کہ جب میں آزاد ہوا تھا، اس وقت میری عمر صرف پندرہ سال تھی، جس میں عام طور پر نوجوانوں کے لیے گم راہی کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔

۱۹۱۴ میں میں نے مولوی کا امتحان دیا اور ریاضی میں کم زور ہونے کی وجہ سے درجہ دوم میں کامیاب ہوا۔ اُس زمانے میں والد صاحب مرحوم کی مشکلات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں اور ان کی صحت بھی جواب دیتی جا رہی تھی، تاہم وہ اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد تشریف لائے اور مجھے دار العلوم کی جماعت مولوی عالم میں شریک کرا دیا۔ اُس زمانے میں مولانا حمید الدین فراہی مرحوم دار العلوم کے صدر مدرس تھے۔ والد مرحوم مجھے حیدر آباد میں چھوڑ کر بھوپال تشریف لے گئے اور میں یہاں پڑھتا رہا، مگر یہ تعلیم کا سلسلہ چھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ ایک روز بھوپال سے دفعتہً اطلاع آئی کہ والد صاحب پر فالج کا سخت حملہ ہوا ہے، یہ اطلاع پاتے ہی میں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں والدہ ماجدہ کو ساتھ لے کر حیدر آباد سے روانہ ہوا اور بھوپال جا کر والد مرحوم کی خدمت میں منہمک ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ان کے صحت یاب ہونے کی تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور اب زندگی کے تلخ حقائق نے بزور اپنے آپ کو محسوس کرانا شروع کر دیا۔ ڈیڑھ دو سال کے تجربات نے یہ سبق سکھایا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ضروری ہے اور معاشی استقلال کے لیے جدوجہد کیے بغیر چارہ نہیں۔ فطرت نے تحریر و انشا کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا۔ عام مطالعے سے اس کو اور تحریک ہوئی، اسی زمانے میں جناب نیاز فتح پوری سے دوستانہ تعلقات ہوئے اور ان کی صحبت بھی وجہ تحریک بنی۔ اس کے علاوہ دفتری ملازمت کی طرف طبعاً کوئی میلان نہ تھا اور اس قسم کی زندگی اختیار کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ غرض ان تمام وجوہ کی بنا پر یہی فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلۂ معاش قرار دینا چاہیے۔

میدان صحافت میں

۱۹۱۸ میں سب سے پہلے میرے بڑے بھائی ابوالخیر مودودیؒ نے اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھا اور اخبار ''مدینہ'' (بجنور) کے ایڈیٹر ہوئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ گیا اور ہم دونوں نے ساتھ مل کر کام شروع کیا، لیکن ڈیڑھ دو ماہ سے زیادہ ہم وہاں نہ نباہ سکے۔ وہاں سے ہم دہلی واپس آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان میں سیاسی تحریک کے زبردست طوفان کی ابتدا ہو رہی تھی۔ کچھ فطری آزاد خیالی، کچھ ذاتی مطالعے، کچھ خاندانی روایات اور کچھ ماحول

کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہمیں ابتدا ہی سے فرنگیت اور فرنگی تسلط سے نفرت تھی اور طبیعت ایسی ہر تحریک کو قبول کرنے پر آمادہ تھی، جو ہندستان کو اس تسلط سے آزاد کرنے کے لیے کی جائے۔ اس کے ساتھ مذہبی جذبات بھی شریک ہو گئے۔ بہر حال ان وجوہ سے ہم نے ''انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام'' میں کام کرنا شروع کیا اور پھر ۱۹۱۹ میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی حصہ لیا۔ اسی زمانے میں میں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی، مگر وہ ابھی زیرِ طبع ہی تھی کہ میرے ایک عزیز نے پولس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اُسے ضبط کرا دیا۔

اس زمانے میں ہماری ملاقات ایک اور صاحب سے ہوئی، جو صوبہ متوسط کے رہنے والے تھے اور ''انجمن اعانتِ نظر بندانِ اسلام'' کے روحِ رواں تھے۔ تاج الدین اُن کا نام تھا۔ انھوں نے جبل پور سے ''تاج'' نامی ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور اُس کی ایڈیٹری ہم دونوں کے سپرد کی، مگر وہ زمانہ اخبار کے لیے سخت ناسازگار تھا۔ چند ماہ سے زیادہ ''تاج'' نہ نکل سکا اور ہم جبل پور سے بھوپال اور بھوپال سے دہلی واپس چلے گئے۔ اب اخبار نویسی کی ضروریات نے مجھے انگریزی پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ خوش قسمتی سے ایک شفیق استاد مولوی محمد فاضل صاحب مجھے مل گئے، جنھوں نے میری طبیعت کا اندازہ کر کے یہ سمجھ لیا کہ اس شاگرد کو پرائمر اور کنگ ریڈر پڑھائی گئی تو اس کا دل اکھڑ جائے گا۔ اس لیے اُنھوں نے ابتدا ہی ایک ایسی کتاب سے کرائی، جو ایک زمانے میں میٹرک کے نصاب میں شریک تھی۔ یہ تعلیم چار پانچ مہینے سے زیادہ نہ رہی اور اس مدت میں بھی کبھی ایک گھنٹے سے زیادہ استاد صاحب کی توجہ مجھے حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن اس مدت میں جو کچھ میں نے پڑھ لیا، اس کے بعد میں استاد سے بے نیاز ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے خود انگریزی اخبارات، رسائل اور کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا اور دو سال تک صرف اسی ایک کام میں منہمک رہا۔ اول اول میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ مگر اس کے باوجود میں ہر قسم اور ہر موضوع کی سہل اور مشکل عبارتیں پڑھے جاتا تھا اور لغت کی مدد سے اُن کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ الفاظ اور ان کے معانی اور ان کے محلِ استعمال اور مختلف اسالیبِ بیان میرے ذہن نشین ہوتے چلے گئے اور میں نے اتنی استعداد بہم پہنچالی کہ انگریزی زبان میں

تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، مذاہب اور عمرانیات کا مطالعہ کر سکا اور کبھی مجھے علمی مضامین کے سمجھنے میں دقت پیش نہیں ہوئی۔

اب تک میری اور میرے بھائی کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تھی، مگر ۱۹۲۰ سے ہم دونوں کی راہیں الگ ہوگئیں۔ بھائی نے اخبار نویسی کو عملاً چھوڑ دیا اور میں بالکل اُسی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تاج الدین صاحب نے جبل پور سے پھر "تاج" نکالا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا اور پھر روزانہ ہوگیا اور میں تنہا اس کو چلاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وہاں عملاً سیاسی کام بھی کیا۔ جبل پور میں خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ شریک کرنے والوں میں ایک میں بھی تھا۔ اس زمانے میں وہاں مسلمانوں کی طرف سے بولنے والا کوئی نہ تھا، اس لیے مجھے مجبوراً تقریریں بھی کرنا پڑیں حالاں کہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ بہرحال اس دوسری مرتبہ جبل پور کے قیام نے مجھے دو بڑے فائدے پہنچائے، ایک یہ کہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی، جو پہلے نہ تھی۔ پہلے میں ذمے داری کے کاموں سے گھبراتا تھا اور جب کوئی ایسا کام درپیش آتا تھا تو میں جھجکتا ہوا اس کی طرف بڑھتا تھا۔ لیکن جبل پور میں جب میں نے تنہا، کسی دوسرے کی مدد کے بغیر صرف اپنی ذمے داری پر اخبار نویسی اور پبلک کی خدمت کی، تب مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر کچھ مخفی قوتیں ہیں، جو ضرورت کے موقعے پر خود ابھرتی ہیں اور میری مدد کرتی ہیں۔ اس وقت سے پھر کبھی میں کسی ذمے داری کو قبول کرنے سے نہیں جھجکا۔ دوسرا فائدہ مجھے یہ حاصل ہوا کہ میں اپنی زندگی میں کلیتاً خود مختار ہوگیا اور جبل پور میں مجھے خود اختیاری کو عملاً برتنے کا موقع مل گیا۔ اس سے پہلے میں ہمیشہ کسی نہ کسی عزیز کے ساتھ رہا تھا اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کی کمزوری کسی نہ کسی حد تک میرے اندر موجود تھی۔

جبل پور کی صحافتی زندگی زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکی، بدقسمتی سے میرے ایک مضمون پر حکومت نے گرفت کی اور چوں کہ اخبار کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے تاج الدین صاحب کا نام شائع ہوتا تھا، اس لیے ان پر مقدمہ چلا دیا گیا۔ گو اس طرح میں حکومت کی گرفت سے بچ گیا، لیکن مجھے اس سے بچنے کی کوئی خوشی نہ ہوئی اور آئندہ کے لیے

میں نے عہد کرلیا کہ دوسروں کی ذمے داری پر اخبار نویسی نہ کروں گا، بلکہ اپنی ہر جنبشِ قلم کی ذمے داری خود اپنے سر لوں گا۔

۱۹۲۰ کے خاتمے پر میں دہلی واپس ہوا۔ ۱۹۲۱ کا ابتدائی زمانہ تھا، جب میری ملاقات مولانا مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعید صدر و ناظم جمعیت علمائے ہند سے ہوئی۔ اسی سال انھوں نے جمعیت علمائے ہند کی طرف سے اخبار ''مسلم'' نکالا اور مجھے اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ اخبار ۱۹۲۳ تک جاری رہا اور آخر تک میں ہی اس کا ایڈیٹر رہا۔

۱۹۱۶ سے ۱۹۲۱ تک کا زمانہ میرے لیے سخت مصائب، خانہ بدوشی اور پراگندہ حالی کا زمانہ تھا۔ اس لیے گو مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کا افسوس تھا، مگر میں اس نقصان کی تلافی کرنے پر قادر نہ تھا۔ ۱۹۲۱ میں جب مجھ کو اطمینان کے ساتھ دہلی بیٹھنا نصیب ہوا تو پھر تکمیلِ علم کی طرف توجہ کی اور اخبار نویسی سے جو کچھ وقت بچا اسے مختلف اساتذہ سے عربی ادب، تفسیر، حدیث و فقہ، منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھنے میں صرف کیا اور ہر فن کے متعلق ضروری استعداد بہم پہنچائی۔

مشغلہ تصنیف و تالیف

۱۹۲۳ میں ''مسلم'' بند ہو گیا اور میں نے حیدر آباد کے قصد سے دہلی چھوڑ دی، لیکن رستے میں بھوپال نے دامن پکڑ لیا اور میں نے حیدر آباد کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بھوپال میں ڈیڑھ سال تک میں ہمہ تن مطالعہ میں مشغول رہا اور بجز ایک دو مضامین کے تحریر کا کوئی کام نہ کیا۔ ۱۹۲۴ کے آغاز میں پھر دہلی واپس گیا۔ وہاں مولانا محمد علی مرحوم سے مراسم پیدا ہوئے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ مجھے ''ہمدرد'' میں اپنا مددگار بنائیں، لیکن اسی زمانے میں مولانا احمد سعید نے جمعیت علمائے ہند کی جانب سے اخبار ''الجمعیۃ'' نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا اور قدیم تعلقات کی بنا پر مجھے ''الجمعیۃ'' کو ''ہمدرد'' پر ترجیح دینا پڑی۔ اس کے علاوہ ترجیح کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میں فطرتاً خود مختاری کو پسند کرتا ہوں۔ غرض ۱۹۲۵ کی ابتدا سے ''الجمعیۃ'' کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۲۸ کی انتہا تک میں اس اخبار کو تنہا اپنی ذمے داری پر چلاتا رہا۔ اُس زمانے میں اخبار نویسی کے ساتھ مختلف علوم کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ عربی کے درسیات سے بعض انتہائی کتابیں جو رہ گئی تھیں، ان کا درس بھی لیا اور دو

کتابیں بھی لکھیں، جو ''الجہاد فی الاسلام'' اور ''دولتِ آصفیہ و حکومت برطانیہ'' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

اُس زمانے میں میں نے جرمن زبان بھی سیکھنے کی کوشش کی، مگر جن صاحب سے میں نے پڑھنا شروع کیا تھا وہ ڈیڑھ مہینے سے زیادہ دہلی میں نہ رہے۔ اس لیے میں اپنے ارادے کی تکمیل میں ناکام رہا۔

اب وہ زمانہ آیا جب دس سال کے مسلسل تجربات نے مجھے ہندستان اور خصوصاً اردو زبان کی اخبار نویسی سے بالکل بے زار کر دیا تھا اور میرے لیے یہ زندگی سوہانِ روح ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ۱۹۲۸ کے خاتمے پر میں نے ''الجمعیۃ'' سے قطع تعلق کر لیا اور آئندہ کے لیے تصنیف و تالیف کے شغل کو اپنے لیے پسند کیا، لیکن جن مضامین سے مجھ کو دلچسپی ہے، اُن پر تحقیقات کے لیے دہلی میں مواد بہم پہنچنا مشکل تھا، اس لیے پھر اسی سرزمین کی طرف مجھے رُخ کرنا پڑا، جہاں سے بارہ برس قبل میں یہ سمجھ کر نکلا تھا کہ شاید کبھی یہاں آنا نصیب نہ ہوگا۔ دسمبر ۱۹۲۸ میں میں حیدر آباد پہنچا اور اگست ۱۹۳۰ تک یہاں رہا۔ اس مدت میں میں نے تاریخِ آل سلجوق تالیف کی اور ابن خلکان کے اُن حصوں کا ترجمہ کیا، جو مصر کے فاطمی خلفاء سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگست ۱۹۳۰ میں میں بیمار ہو کر دہلی واپس چلا گیا۔ چند مہینے وہاں رہ کر صحت درست کی۔ پھر چند مہینے بھوپال میں رہ کر ایک مفصل تاریخِ دکن کا مواد فراہم کرتا رہا، جسے لکھنے کا میں ایک عرصے سے ارادہ کر رہا تھا۔ جولائی ۱۹۳۱ میں پھر حیدر آباد واپس آیا اور تاریخِ دکن کا مواد فراہم کرنے میں منہمک ہو گیا۔ اس سلسلے میں میں نے نظام الملک آصف جاہ اوّل کی سیرت لکھی، جو عنقریب مکمل ہو جائے گی اور ایک مختصر تاریخِ دکن لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔ آج کل میں جامعہ عثمانیہ کے لیے علاّمہ صدرالدین شیرازی کی کتاب ''الاسفار الاربعہ'' کا ترجمہ کر رہا ہوں، جو عربی میں فلسفے کی ایک ادق کتاب ہے۔

تحریر و انشا کی طرف میلان

تحریر و انشا کی طرف میرے فطری میلان کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا، جب میں نو برس کا تھا۔ اس زمانے میں میرے ایک قریبی عزیز جناب اشفاق احمد زاہدی (صاحب فراست الید)

جن کو مضمون نویسی اور کتب بینی کا شوق تھا اورنگ آباد آئے اور کچھ مدت کے لیے ہمارے ہاں ٹھہرے۔ انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کے دلوں میں انشا پردازی کا شوق پیدا کیا اور درسی کتابوں کے علاوہ عام رسالے اور اخبارات پڑھنے کی طرف بھی متوجہ کیا۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہماری صلاحیت کا امتحان لینے کے لیے کہا کہ اپنے خیال میں یہ سمجھ لو کہ کسی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہو اور اپنے اس خیالی معشوق کو خط لکھو، جس میں محبت کے جذبات اور ہجر کی تکالیف کا اظہار ہو۔ یہ ایک ایسا مضمون تھا، جس سے ہم بالکل نابلد تھے اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق اور معشوق اور محبت اور ہجر کے تصور کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مگر اس زمانے میں گلستاں بوستاں پڑھ چکا تھا اور اس سے صرف اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ عشق کوئی مرض ہے، جو کسی اچھی صورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے اور اس مرض سے دل کے اندر آگ لگ جایا کرتی ہے، جو صرف اس کے ملنے ہی سے بجھتی ہے اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت غریب بیمار جلتا رہتا ہے اور اس حالت کا نام ہجر ہے۔ ان معلومات کو ہم نے اس وقت اپنی بساط کے مطابق خوب استعمال کیا اور ایک لمبا چوڑا خط ان کیفیات کے بیان میں لکھ کر پیش کر دیا۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو یاد نہیں اور نہ بھائی اشفاق کو یاد ہے کہ ہم نے اس وقت کیا لکھا تھا، مگر یہ ضرور یاد ہے کہ وہ ان خطوط کو دیکھ کر پھڑک گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ میرے خط کو انھوں نے زیادہ پسند کیا تھا۔ اگرچہ عبارت کے اعتبار سے بڑے بھائی کا خط زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

اس کے بعد گو مجھے ایک مدت تک لکھنے کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا، کیوں کہ والد مرحوم کی شدید نگرانی کی وجہ سے اپنا بیشتر وقت تعلیم میں صرف کرنا پڑتا تھا، مگر تعلیم سے جو کچھ وقت بچتا تھا، اس میں اردو کی مختلف کتابیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا، جس سے مختلف مضامین اور اسالیبِ بیان ذہن نشیں ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۴ میں مولوی کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مجھے تھوڑی سی فرصت میسر آ گئی اور والد مرحوم نے دماغ کو آرام دینے کی ہدایت فرمائی۔ اس فرصت کے زمانے میں اپنے بھائی کی تحریک پر میں نے قاسم امین بے کی کتاب ''المراۃ الجدید'' کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اب خدا جانے اس ترجمے کے اوراق کہاں ہیں، مگر مجھے خوب یاد

ہے کہ اس ترجمے کی روانی اور سلاستِ زبان اور چٹخارے دار محاورے دیکھ کر والد مرحوم بہت خوش ہوئے تھے اور بھائی نے خوب داد دی تھی۔

یہ میری ابتدائی مشق تھی۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ میں بھوپال میں قیام ہوا اور عام مطالعے کے ساتھ انشا پردازی کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ اب شاید مرنے سے پہلے پیچھا نہ چھوڑے گا۔ ابتدائی تین چار سال تک نومشقی کی حالت تھی، جس کا اندازِ تحریر پسند آ جاتا تھا، اُس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا، مگر جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا، میں یہ محسوس کرتا گیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا نہیں ہے، بلکہ خود اپنے انداز میں لکھنا ہے۔ ۱۹۲۱ سے خود اپنا مستقل رنگ اختیار کیا ہے، جس میں میں کسی کا مقلد نہیں ہوں۔

میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں وہی الفاظ ہیں، جو اس خیال کے ساتھ خود بخود چلے آتے ہیں، لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہیے، باقی رہے الفاظ تو ان کے انتخاب میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آپ سے آپ مضمون کے ساتھ آ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جب کبھی کچھ لکھنا ہوتا ہے تو میں تمام تر کوشش صرف خیالات کو مجتمع کرنے اور دلائل و شواہد اور مواد فراہم کرنے میں صرف کرتا ہوں اور جب دماغ میں مضمون مرتب ہو جاتا ہے، تو پھر اُسے کاغذ پر منتقل کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔ الفاظ کے انتخاب سے میری بے اعتنائی ایسی بڑھی ہوئی ہے کہ اکثر و بیشتر میں لکھنے کے بعد نظرِ ثانی بھی نہیں کرتا، الاّ اس صورت میں جب کہ کوئی خاص ذمے داری کی تحریر لکھنی ہو۔

شخصیت ــــ چند اشارے

’’جو شخص دوسروں کا اثر قبول کر کے اپنا رنگ چھوڑ دے اور ان کے رنگ میں رنگ جائے، لامحالہ اس کے اندر، چھچھور پن، سرعتِ انفعال اور خفیف الحرکتی کا مرض ضرور ہوگا۔‘‘

’’میرا مزاج کچھ اس قسم کا ہے کہ کچا کام کرنے پر میری طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔‘‘

’’میں ذاتی طور پر یہ تو گوارا کر سکتا ہوں کہ آدمی یا لوگوں کا ایک طبقہ محض سوسائٹی کی بہتری کے لیے جان دے دے، قید ہو جائے یا سخت صعوبتیں برداشت کرے، مگر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اچھے سے اچھے مقصد کے پیش نظر بھی اپنی خودی ختم کر دے۔ شخصیت کی قربانی دے یا اپنی فطرت اور اپنی روح سے ہاتھ دھو لے۔‘‘

’’میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، جنھوں نے پروپیگنڈا اور شخصی نزاعات اور سب و شتم کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ بزرگانِ قوم کی پگڑیاں اُچھالنے والوں اور سیاسی اختلافات کو ذاتی عداوت میں تبدیل کرنے والوں کی روش سے میں ہمیشہ بیزار رہا ہوں، جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ اس حقیقت کو بھی جانتے ہیں۔‘‘

’’میں اس سپہ سالار کو احمق سمجھتا ہوں، جو اپنی فوج کے کم زور پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، جو شیلے الفاظ سے اس میں طاقت کا جھوٹا پندار پیدا کرتا ہے اور اسے خطابت کی شراب پلاتا ہے، تاکہ وہ مدہوش ہو کر تباہی کی خندقوں میں کود پڑے۔‘‘

''خدا کے فضل سے میں کوئی کام یا کوئی بات جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور کہا کرتا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے، تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا حساب مجھے خدا کو دینا ہے، نہ کہ بندوں کو، چناں چہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی ایک لفظ بھی خلافِ حق نہیں کہا اور جو کچھ کہا اُس کا کہنا خدمتِ دین کے اس مرحلے پر ناگزیر تھا۔ اس کے کہنے پر نہیں، بلکہ نہ کہنے پر مجھے اندیشہ تھا کہ میں ماخوذ ہوں گا۔''

''یہ تحریف جو دین میں کی جا رہی ہے، اگر میں اس کے آگے سپر ڈال دوں اور جس وضع قطع میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں، اس میں اپنے آپ کو ڈھال لوں، تو میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا، جس کے لیے اللہ کے ہاں مجھ سے سخت باز پرس ہوگی اور اس باز پرس میں کوئی میری مدد کے لیے نہ آسکے گا، لہٰذا میں اپنے آپ کو لوگوں کے مذاق کے خلاف بنائے رکھنا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں، بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو اس اُخروی خطرے میں ڈالوں۔''

''مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی اخلاقی پستی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اُن کی بستیوں میں خدا کا قانون توڑنے والے مزے سے دندناتے پھرتے ہیں اور رب العالمین کے قانون کی پابندی کرنے والے اور اُس کی اطاعت کی تلقین کرنے والے اُلٹے نکو بن جاتے ہیں۔''

''میرے برادرانِ دینی خواہ میری بات سنیں یا نہ سنیں مگر میں تو یہی کہتا رہوں گا کہ تمھارے لیے اب اس کے سوا کسی چیز میں خیریت نہیں ہے کہ سچے مسلمان بنو اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمھارا جو فرض ہے اُسے ادا کرو۔''

''میرے جرأت آمیز الفاظ سے آپ کو شاید یہ گمان گزرا ہوگا کہ میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں، حالاں کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، صرف اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کر رہا ہوں اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں۔ بڑے مراتب تو درکنار اگر صرف سزا سے بچ جاؤں، تو یہ بھی اُمیدوں سے بہت زیادہ ہے۔''

''یہ ایک لاحاصل سوال ہے کہ میں نے کس عالم سے فیض حاصل کیا ہے؟ یہ سوال تو اُس سے کرنا چاہیے، جس نے کوئی علمی کام نہ کیا ہو اور جس کے علمی مرتبہ ومقام کو جاننے کے لیے مدرسہ کی سند اور استادوں کے ناموں کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ ہو۔ میں نے کام کیا ہے اور میرا کام کوئی چھپا ہوا نہیں، بلکہ چھپا ہوا سب کے سامنے موجود ہے۔ اس کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ میں نے کیا کچھ پڑھا ہے اور جو کچھ پڑھا ہے اُسے کتنا ہضم کیا ہے۔''

''میں اپنی کم زوریوں سے خوب واقف ہوں اور انھی کم زوریوں کا احساس ہے، جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ میں خداوند عالم سے علم صحیح اور عقل سلیم کے لیے دعا کروں، محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کر کے اس کام پر آمادہ کیا ہے، جس کے دشوار گزار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف اور اپنی کم زوریوں کو دیکھ کر دوسری طرف، میری روح لرز اٹھتی ہے۔ بہر حال محض خدا کے بھروسے پر میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے اور ان تمام حکمتوں کو پیشِ نظر رکھ کر، جن کی طرف اوپر اشارہ کر چکا ہوں، اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔''

''خدا شاہد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی سے مجھ کو کوئی ذاتی عداوت نہیں ہے۔ میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں، جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے، اُس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے اور جسے باطل سمجھا ہے، اس کے بطلان پر بھی دلائل بیان کر دیے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے، تو میں اپنی رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ کچھ ان کی پارٹی یا اُن کی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے۔ غضب ناک ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل، تو ایسے لوگوں کے غیظ وغضب کی مجھے کچھ پروا نہیں۔ میں نہ ان کی گالیوں کا جواب دوں گا اور نہ اپنے طریقے ہی سے ہٹوں گا۔''

''میری یہ صاف گوئی اُن حضرات کو یقیناً بہت بری معلوم ہوگی، جو رجال کو حق سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے خوگر ہیں اور اس کے جواب میں چند اور گالیاں سننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے، مگر میں جب دیکھتا ہوں کہ مذہبی پیشوائی

کی مسندِ مقدس سے مسلمانوں کی غلط رہ نمائی کی جا رہی ہے، اُن کو حقائق کے بجائے اوہام کے پیچھے چلایا جا رہا ہے اور خندقوں سے بھری ہوئی راہ کو شاہراہِ مستقیم بتا کر اُنھیں اس کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تو میں کسی طرح اس پر صبر نہیں کر سکتا۔ کوشش بھی کروں تو میرے اندر اس پر صبر کی طاقت نہیں ہے، لہٰذا مجھے اس پر راضی ہو جانا چاہیے کہ جو کوئی میری صاف گوئی پر ناراض ہوتا ہو، تو ہو جائے۔ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔

مفادِ دین واُمت کے تقاضے

"میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف دِہ بات نہیں ہو سکتی کہ اپنی قوم کے جن اکابر کا انتہائی احترام میرے دل میں ہے، اُن کے خلاف زبان کھولوں۔ اکابرِ قوم تو درکنار ایک عامی مسلمان کی عزت بھی میرے لیے نہایت بیش قیمت ہے، لیکن صرف دو چیزیں ہیں، جو مجھ کو اس وقت زبان کھولنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ ایک یہ کہ میرے نزدیک خدا کا دین اور اُس کی امت مسلمہ کا مفاد دنیا کی ہر شے اور ہر تعلق سے زیادہ قیمتی ہے اور جب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ اس کو نقصان پہنچا رہا ہے تو میں اس کی مزاحمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، خواہ وہ میرا قریب ترین عزیز ہو، دوست ہو، استاد ہو یا میری قوم کا بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس معاملے میں کسی تعلق یا کسی نیازمندی کی پروا کرنے سے میں بالکل معذور ہوں، جس کسی کو میرے اس طرزِ عمل سے تکلیف ہو، وہ اگر اپنا حق پر ہونا دلیل سے ثابت کر دے گا، تو میں نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا، بلکہ نہایت ادب سے معافی بھی چاہوں گا، خواہ وہ دینوی اعتبار سے حقیر ترین آدمی ہو اور اگر وہ مجرد شکایت کرے گا تو میں صاف عرض کروں گا کہ حق کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے اپنے اور پرائے کی تمیز سے مجھے معاف رکھا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس شخص کو میں دینی یا قومی معاملے میں غلطی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں خود اس کی عاقبت کا خیال مجھے مجبور کرتا ہے کہ دنیا ہی میں اس کو اصلاح کی طرف لانے کی کوشش کروں۔ میرے نزدیک ہر مسلمان کا اور خصوصاً مسلمانوں کے علماء اور اکابر کا میرے اوپر یہ حق ہے کہ ان کو ایسی غلطیوں سے بچانے کی کوشش کروں، جن کے متعلق میں اپنی تحقیق کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں وہ ان پر ماخوذ ہوں گے اور یہی حق میرا بھی دوسروں پر ہے کہ وہ اپنی ذمے داری کو سمجھیں۔"

کھری معاملت

''اگست ۱۹۴۷ء سے اب تک پونے دو سال میں ہم رسالہ کے خریداروں کو صرف پانچ پرچے دے سکے ہیں۔ پہلے ڈیکلریشن منظور کرنے میں حکومت نے چھ مہینے لگادیے تھے۔ اب میری گرفتاری کے بعد دوسری ڈیکلریشن کی منظوری میں مہینوں کی دیر لگادی گئی۔ ان حالات میں رسالہ کا جاری رہنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ نہ تو میرے مالی حالات ہی اس کی اجازت دیتے ہیں کہ رسالے کے اسٹاف کو خواہ مخواہ روکے رکھوں اور اُن کے معاوضے مفت دیتا رہوں اور نہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ لوگوں کا چندہ میرے پاس غیر معلوم مدت تک رُکا رہے اور اُس کا بدل ان کو نہ ملے۔ اس وقت تو میں اس قابل ہوں کہ اُن کے چندے اُنھیں واپس کرسکتا ہوں، مگر آگے کے حالات کچھ معلوم نہیں کیا رنگ اختیار کریں۔ بالفرض اگر میں آئندہ اس پرچے کو جاری رکھنے کے قابل بھی نہ رہا اور لوگوں کے چندے واپس کرنے کی طاقت بھی مجھ میں نہ رہی، تو خدا کے ہاں کس کس کے حساب کی جواب دہی کرسکوں گا، لہٰذا آپ مقامی احباب کے مشورے سے پرچے کی بندش کا اعلان کردیں اور خریداروں کو ایک گشتی چٹھی بھیج کر اُن سے پوچھ لیں کہ آیا وہ نقد رقم واپس لینا چاہتے ہیں، یا کتابوں کی صورت میں؟ جو لوگ نقد چاہیں انھیں نقد ادا کی جائے اور جو کتابیں چاہیں انھیں مکتبہ سے کمیشن پر کتابیں لے کر بھیج دی جائیں۔ ہر خریدار کا حساب اس کی گشتی چٹھی میں درج کردیا جائے کہ اس کا کتنا چندہ ہمارے ذمے باقی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آئندہ اس پرچے کو پھر جاری کرنے کی توفیق بخشی تو ان خریداروں کو اطلاع دے دی جائے گی۔ چراغ الدین صاحب کے لیے کوئی دوسرا ذریعۂ معاش تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ سرِدست پرچے کے حسابات بند کرنے کے لیے شاید ایک دو مہینے اُن کو روکنا ہوگا، تاہم اگر اس مدت کے اندر ہی انھیں کوئی دوسری جگہ مل جائے، تو ان کو ہرگز نہ روکا جائے۔ آپ خود ان سے چارج لے لیجیے گا اور مقامی رفقا کی مدد سے خریداروں کے حسابات صاف کردیجیے گا۔''

(مکتوب بنام مولانا ابوالخیر صاحب، مورخہ ۶ راپریل ۱۹۴۹)

نہ تملُّق نہ بدزبانی

’’مجھے یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ مجھ سے ہمدردی رکھنے والے کسی شخص نے قائدِ اعظم مرحوم اور ان کی ہمشیرہ محترمہ کے بارے میں کریہہ اور نازیبا کلمات استعمال کیے۔ یہ بات میرے طریقے اور مسلک کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے اپنی پوری پبلک لائف میں گالیاں کھائی تو بہت ہیں، مگر الحمدللہ کہ کبھی گالی دی نہیں۔ میں نے اصولاً جس کی رائے اور پالیسی سے مجھے اتفاق نہیں رہا ہے۔ اس پر بے خوف تنقید کی ہے، مگر نہ میں تملق سے کبھی ملوث ہوا ہوں اور نہ بدزبانی سے۔ شخصی طور پر میں نے ہمیشہ ان لوگوں کا پورا احترام ملحوظ رکھا ہے، جن سے قومی یا دینی معاملات میں اختلاف کیا ہے۔ میں صرف ایماندارانہ اور بامقصد تنقید کا قائل ہوں اور خدا اور رسولؐ کے سوا کسی کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا۔ آپ نے ان حضرات کے نازیبا جملوں کے جواب میں مجھ پر یا میرے گھر والوں پر جو بھی حملے کیے ہوں، میں انھیں صدقِ دل سے معاف کرتا ہوں۔ (فجزاه الله تبارك و تعالٰی فی الدارین خیراً) بلکہ میری طرف سے اُن سب لوگوں کے لیے عام معافی ہے، جو میرے پیچھے یا میرے سامنے مجھے گالی دیں۔ مجھے کبھی اس سے خوشی نہیں ہوسکتی کہ میری وجہ سے کوئی خدا کے ہاں ماخوذ ہو۔ آگے خدا کو اختیار ہے، جسے چاہے معاف فرمائے اور جسے چاہے پکڑے۔‘‘ (حافظ ریاض احمد کے نام)

معروف کردار

’’برادرم! میں اس وقت ایسی پوزیشن میں ہوں کہ اپنے خلاف کسی الزام کی تردید کرنا تو درکنار، اکثر حالات میں یہ جاننا بھی میرے لیے مشکل ہے کہ باہر کیا الزام مجھ پر لگایا جارہا ہے۔ یہ ایک نادر موقع ہے، جس کے لیے بھی مجھ پر حملہ آور ہونا مفید ہوسکتا ہو اس کو ضرور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انسان کا گوشت ویسے ہی ایک لذیذ چیز ہے، پھر جب کہ وہ مفت بٹ رہا ہو، تو ہمارے موجودہ اخلاقی ماحول میں بھلا ایسے زاہد کتنے نکل آئیں گے، جو اس سے متمتع ہونے میں تامل کرجائیں۔

صحرائی صاحب نے تو جو کچھ کیا اس کا مجھے کوئی رنج نہیں، کیوں کہ وہ مجھے نہیں جانتے،

اور جانتے بھی ہوں، تو اُن کے کرنے کا کام وہی ہے، جو انھوں نے کیا، مگر آپ نے مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا تو نے پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار کیا اور کیا تو نے قائداعظم مرحوم کو گالیاں دیں؟ اس سے فی الواقع مجھے بڑی اذیت ہوئی، کیوں کہ آپ سے میری توقعات کچھ اور تھیں۔ برادرِعزیز! کیا اب کوئی ذلیل بہتان بھی میرے مرتبے سے اتنا فروتر نہیں رہا کہ آپ اُسے سن کر سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ کہہ سکیں اور مجھ سے اس کے دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھیں؟ اور بالفرض اگر تحقیق کرنا ضروری ہی تھا، تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں کوئی اجنبی یا غیر معروف آدمی تو نہیں ہوں۔ کم و بیش تیس سال سے پبلک لائف میں ہوں، برسوں اخبار نویسی کر چکا ہوں، سترہ برس سے ''ترجمان القرآن'' نکال رہا ہوں۔ کتابوں اور رسالوں کی شکل میں میرے لکھے ہوئے ہزاروں صفحے موجود ہیں، جن کو بلا مبالغہ لاکھوں آدمی پڑھ چکے ہیں۔ پاکستان اور ہندستان میں ہزارہا آدمی موجود ہیں، جنھوں نے اپنے کانوں سے میری تقریریں سنی ہیں۔ ہزاروں آدمی ذاتی طور پر میرے جاننے والے موجود ہیں۔ خود شہر لاہور میں برسوں رہ چکا ہوں، آپ نے کیوں نہ پبلک میں اعلان کیا کہ جو شخص ابوالاعلیٰ کو ایک بدزبان اور یاوہ گو انسان کی حیثیت سے جانتا ہو وہ اپنی شہادت پیش کرے؟ آپ نے کیوں نہ میرے نئے اور پرانے ہمسایوں سے پوچھا کہ انھوں نے کبھی کوئی گالی یا بیہودہ بات میری زبان سے سنی ہے؟ آپ نے کیوں نہ میرے ذاتی ملازموں سے پوچھا کہ میں نے ان کو کبھی سخت سست کہا ہے؟ نہیں بلکہ جو لوگ وقتاً فوقتاً مجھ کو گالیاں دیتے رہے ہیں اور آج بھی گالیوں سے نواز رہے ہیں، آپ نے اُنھی سے قسم دے کر پوچھ لیا ہوتا کہ کبھی میں نے بھی ان کو گالی کا جواب گالی سے دیا ہے؟ یہ ساری شہادتیں اگر دنیا سے ناپید ہو چکی ہوتیں، تو البتہ آپ حق بہ جانب تھے کہ مجھ سے دریافت فرماتے۔

''پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار'' اور وہ بھی میری زبان سے! سبحان اللہ! میرے عزیز! تھوڑی دیر کے لیے دین و ملت کے سوال کو بھی نظرانداز کر دیجیے۔ خالص مادّی نقطۂ نظر ہی سے دیکھیے، تو بھلا یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے کہ جو شخص خود اپنے بال بچوں سمیت اس کشتی میں سوار ہے، وہ اس میں چھید کرے گا؟ کیا وہ خود یہ چاہے گا کہ اس کا اور اس کے بیوی بچوں اور بیٹیوں کا وہی حشر ہو، جو اس کی آنکھیں مشرقی پنجاب میں اپنی قوم کی بہنوں اور

بیٹیوں کا دیکھ چکی ہیں؟ اس قسم کا عجیب سوال مجھ سے کرنے کے بجائے آپ نے جیل کے ڈاکٹر سے پوچھا ہوتا کہ ابوالاعلیٰ اس قید کے زمانے میں کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟ اگر میں عقل و خرد سے محروم نہیں ہوں، تو کیا غیرت، حمیت، شرافت سب آپ ہی لوگوں کے حصے میں آگئی ہے؟ میرے اندر اس کا شائبہ بھی نہیں رہا۔" (شورش کاشمیری کے نام)

جان دے سکتا ہوں رعایت کی درخواست نہیں کر سکتا

"آپ کا بالمشافہ معائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے، لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اِس کی گنجائش نہیں ہے۔ اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بہ طورِ خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے، لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اُصول کے خلاف ہے۔ میں جان دے سکتا ہوں مگر رعایت کی درخواست نہیں کر سکتا، لہٰذا جو کچھ علاج آپ غائبانہ کر سکتے ہوں بس اسی پر اکتفا فرمائیں۔" (حکیم محمد شریف کے نام)

چٹان اور مچھر

"مجھے اس بات کی بڑی فکر تھی کہ میری نظر بندی کی مدت بڑھنے کا آپ کی صحت پر کچھ برا اثر نہ پڑا ہو۔ اب آپ کے والا نامہ سے یہ معلوم کر کے بہت اطمینان ہوا کہ آپ نے اسے اسی استقلال کے ساتھ برداشت کیا ہے، جس طرح ایک مومن خاتون کو برداشت کرنا چاہیے، جس راستے پر میں برسوں سے چل رہا تھا اس میں یہ منزل تو بہر حال آنی ہی تھی۔ حیرت اس کے آنے پر نہیں، بلکہ اس بات پر ہے کہ اتنی دیر سے کیوں آئی۔ درحقیقت میں تو اسی پر حیران ہوں کہ شیطان اور اس کی برادری نے مجھے اتنے دنوں برداشت کیسے کیا۔ بہر حال اب کہ وہ ادھر متوجہ ہو گئے ہیں، یہ اُمید نہ رکھیے کہ یہ کش مکش جلدی ختم ہو جائے گی۔ اب اس کا خاتمہ دو ہی طرح ہو سکتا ہے، یا میں ختم ہو جاؤں یا وہ اصلاح ہو کر رہے، جس کے لیے میں پچھلے پندرہ برس سے کام کرتا رہا ہوں۔ ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے، لہٰذا میری ماں اور بھائی اور بیوی اور بچوں اور مجھ سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو اپنا دل کڑا کر لینا چاہیے، اور

ہر بدتر سے بدتر نتیجے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر آپ لوگ اُس طرح کی غلط امیدیں قائم کریں گے، جو گزشتہ چھ ماہ میں شاید قائم کر لی گئی تھی، تو بلاوجہ اپنے آپ کو خلافِ توقع صدمات سے دوچار کریں گے۔ آپ یقین فرمائیں کہ ایک شیطانی طاقت دنیا میں زیادہ سے زیادہ، جو کچھ کر سکتی ہے میں خدا کے بھروسے پر اُس کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو چکا ہوں۔ لہٰذا جو کچھ سامنے آتا ہے وہ میری توقعات سے کم ہی ہوتا ہے اور میرے ارادے پر اس کا اتنا اثر بھی نہیں ہوتا، جتنا کسی چٹان پر مچھر کے حملے کا ہوتا ہے۔ وما توفیقی الا باللّٰہ العلی العظیم۔"

(والدہ ماجدہ کے نام ایک خط کا اقتباس)

ناقابلِ تسخیر و بیع

"اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن، خیالات اور مقصدِ زندگی ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی دلیل سے بدلا جا سکے گا، تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں، بلکہ شفا خانہ امراض دماغی ہے اور اس نے، جو یہ توقع قائم کی تھی کہ اس دباؤ میں آ کر میں اپنا ضمیر اس کے ہاتھ رہن رکھ دوں گا اور آئندہ سے راشن کیے ہوئے خیالات ظاہر کرنے لگوں گا، تو میں اس کو مطلع کرتا ہوں کہ اس نے میری سیرت کو اپنی سیرت پر قیاس کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرا دِل صداقت کے لیے ہر وقت کھلا ہوا ہے اور میری ہر رائے کو علمی و عقلی دلائل سے بدلا جا سکتا ہے، لیکن میرا ایمان و یقین کوئی قابلِ بیع و رہن چیز نہیں ہے اور آئندہ بھی، جو کرے گا ان شاء اللہ منہ کی کھائے گا۔"

مستحکم نظر! مستحکم سیرت

"میں نے اپنی ۴۹ سالہ عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے۔ اس تیس سال کی مدت میں پڑھ کر، سن کر، سوچ کر اور مشاہدہ اور تجربہ کر کے میرے ذہن کا ایک خاص سانچہ بن چکا ہے۔ میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے۔ میری فکر کا ایک خاص انداز اور سوچنے کا ایک خاص طرز قائم ہو چکا ہے۔ میں کچھ رائیں رکھتا ہوں، جن کی پشت پر برسوں کے مطالعے سے فراہم کیے ہوئے دلائل ہیں۔ میں نے کچھ چیزوں کو حق پایا ہے اور ان پر

میں پورے قلبی اور دماغی اطمینان کے ساتھ ایمان لایا ہوں اور کچھ چیزوں کو میں نے باطل پایا ہے اور ان کو قلب و دماغ کے متفقہ فیصلے کے ساتھ رد کر چکا ہوں۔ میرے ذہن اور میرے ضمیر کے یہ فیصلے میری ذات کی حد تک بھی محدود نہیں رہے ہیں، بلکہ میں برسوں سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں اور ہزاروں آدمیوں کو میں نے اس نصب العین کی طرف کھینچا ہے، جسے میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ ہزاروں کو اس حق کا قائل کیا ہے، جس حق کا میں خود قائل ہوا تھا۔ ہزاروں کا رشتہ اس باطل سے کٹوایا ہے، جس سے میں نے خود اپنا رشتہ کاٹا تھا۔ ہزاروں بندگانِ خدا کی زندگیوں کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی اس جدوجہد میں مبتلا کر دیا ہے، جس میں خود مبتلا ہوں۔''

تصورِ ادب

''معاش کے لیے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لیے اینٹیں ڈھولے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے۔ یہ کام محض معاش کے لیے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو تو بالکل اپنے نظریہ و مسلک پر کرنا ہوگا۔''

ترجمان القرآن، تطہیر و تنویرِ افکار

''اس رسالے ''ترجمان القرآن'' کی ترقی کے لیے بہت سی تمنائیں میرے دل میں ہیں۔ جس طرز پر یہ نکل رہا ہے میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ایک زبردست انقلابی طاقت بن جائے۔ خیالات کا رُخ جاہلیت سے اسلام کی طرف پھیر دے۔ افکار کی تطہیر، تنویر اور تعمیر خالص اسلام کے اصولوں پر کرے۔ اسلام جو ایک جامد یادگارِ قدیم بنا کر رکھ دیا گیا ہے، اس کو یہ ایک نامی متحرک اور محرک نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کرے۔ اعلیٰ درجے کی تنقید کے ساتھ دنیا کی ایک ایک گم راہی کا استیصال کرے اور گہری تحقیق کے ساتھ زندگی کے ایک ایک مسئلے کو اصولِ اسلام کے مطابق حل کرے۔ یہ تمنائیں دل میں پال رہا ہوں اور چھ برس سے اپنے جسم کی ساری طاقتیں انھیں حاصل کرنے کے لیے خرچ کر رہا ہوں، مگر بد قسمتی سے اکیلا اور نہتا ہوں، میری طاقت محدود ہے، وسائل مفقود ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں نہیں کر سکتا۔ ساتھ دینے والوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں، مگر وہ کم یاب ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کی اس بستی میں اپنے آپ کو اجنبی اور غریب پاتا ہوں۔ جس جنوں میں مبتلا ہوں، اس کا مجنوں مجھے کہیں نہیں ملتا۔

برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچا تا رہا ہوں۔ ان کے قریب جب بھی جاتا ہوں، تو وہ مجھ سے دور نظر آتے ہیں۔ اُن کی دھن میری دھن سے الگ، ان کی گرویدگی کے مرکز میرے مرکزِ گرویدگی سے جدا۔ ان کی روح میری روح سے نا آشنا۔ ان کے کان میری زبان سے بیگانہ۔ یہ دنیا کوئی اور دنیا ہے، جس سے میری دنیا مانوس نہیں۔''

اسلوبِ تحقیق و ترجمانی

''آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ میں نے سنسکرت زبان اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے براہِ راست واقفیت کے بغیر محض یورپین ترجموں کے اعتماد پر اپنی کتاب میں ویدوں سے کیوں بحث کی؟ لیکن آپ نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ الجہاد فی الاسلام بالکل میرے ابتدائی عہد کی تصنیف ہے۔ جب مذاہب کے معاملے میں میرا رویہ پوری طرح پختہ نہیں ہوا تھا اور نہ وہ احتیاط طبیعت میں پیدا ہوئی تھی، جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ اب اگر میں اس کتاب کو دوبارہ لکھوں گا، تو ہر اس چیز کی، جس کی براہِ راست واقفیت کا موقع مجھے نہیں ملا ہے۔ از سرِ نو تحقیق کروں گا۔ کوئی ہندو عالم.... جو محض حامی دین (Defender of the Faith) ہی نہ ہو، بلکہ خود محقق بھی ہو اور محققانہ انصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہو، اگر میری کتاب کے اُس حصے پر، جو ہندوؤں سے متعلق ہے، تنقید کر کے مجھے بتائے کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے، تو اس سے مجھے بہت مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اگر آپ مجھے کوئی ایسی کتاب بتائیں، جس میں ہندو مذہب کے مقصدِ جنگ اور قوانینِ جنگ کو بناوٹ کے بغیر، جیسے کہ وہ بجائے خود ہیں پیش کیا گیا ہو، تو مزید باعثِ شکر گزاری ہوگا۔ ''بناوٹ کے بغیر'' کی شرط میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ آج کل عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مذہب پر، جیسا کہ وہ بجائے خود ہے، ایمان نہیں رکھتے، مگر قومی عصبیت کی خاطر اس مذہب کو اور اپنے مذہبی طرزِ نسل کو ''معقول'' بنانے کے لیے وہ اکثر موجودہ نظریات کے مطابق ایک نیا مذہب گھڑتے ہیں اور پرانے مذہب کے نام سے اُسے پیش کرتے ہیں۔ مجھے اس طریقے سے سخت نفرت ہے، خواہ اسے مسلمان برتیں، یا ہندو یا کوئی اور۔ میرا خود بھی یہ طریقہ ہے اور میں پسند بھی صرف ایسے ہی لوگوں کو کرتا ہوں، جو اصل مذہب کو جیسا کہ فی الواقع وہ ہے،

ویسا ہی رہنے دیں اور ویسا ہی اسے پیش کریں۔ پھر اگر وہ ماننے کے لائق ہو تو اسے مانیں اور ماننے کے لائق نہ ہو تو اسے رد کر دیں۔"

خطرناک سزا

"یہ ارشاد کہ اس سے شبہ کیا جا رہا ہے کہ تو خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرے گا۔" اس کے جواب میں بجز اس کے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہو سکتا، جو خدا سے ڈرتا ہو، جسے خدا کے سامنے اپنی ذمے داری کا احساس ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت یاد ہو:

اِجۡتَنِبُوۡا كَثِيۡرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ (الحجرات:۱۲)

"بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔"

جو حضرت اس قسم کے شبہات کا اظہار کر کے بندگانِ خدا کو جماعت اسلامی کی دعوت حق سے روکنے کی کوشش فرما رہے ہیں، میں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہیں کر سکیں گے اور وہ یہ سزا ہے کہ ان شاء اللہ میں ہر قسم کے دعوؤں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی اور ان کو بیان کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں۔"

سچا تجربہ

"مولانا... اور ان کے گروہ کے علما نے میرے خلاف، جو پروپیگنڈہ شروع کیا ہے، اس سے میں بے خبر نہیں ہوں، مگر میرے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ بارہا اس طرح کے لوگوں نے طرح طرح کے جھوٹ میرے خلاف پھیلانے کی کوشش کی ہے اور میں نے ہمیشہ ان کے مقابلے میں صبر سے کام لیا ہے۔ میرا اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جھوٹ کو فروغ نہیں دیتا۔"

شریف آدمی کا رویہ

آپ کو معلوم ہے کہ میں اس قسم کی تحریروں کا جواب کبھی نہیں دیا کرتا اس لیے یہ اندیشہ

نہ فرمایئے کہ ان فتووں کے جواب میں یہاں سے کچھ لکھا جائے گا اور بات بڑھے گی۔ لیکن اس کے ساتھ میرا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ جو مجھے ٹھوکر مارے میں اس کے آگے سر جھکا دوں۔ یہ طریقہ نہ اس کام کی عزت کے مطابق ہے، جسے میں کر رہا ہوں اور نہ اس طریقے سے فی الواقع دین ہی کی کوئی مصلحت پوری ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ اگر دیانت اور سچائی کا ہتھیار لے کر حملہ آور ہوتے اور مجھ میں یا جماعت اسلامی کی تحریک و نظام میں کوئی ایسی خرابی پاتے، جو فی الواقع ان کے دلائل سے ثابت ہوتی، تو میں یقیناً ان کے آگے جھکتا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے اپنی اصلاح کرتا، لیکن انھوں نے ہتھیار جھوٹ کا استعمال کیا ہے اور حملہ آور ہونے میں دنائیت کی راہ اختیار کی ہے۔ اس لیے میں ان کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کروں گا، جو ایک شریف آدمی کو کرنا چاہیے۔ یعنی اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔

”مولانا موصوف اور ان کے ساتھیوں نے یہاں آ کر مجھ سے، جو باتیں کیں اور پھر واپس جا کر جو خطرے کی گھنٹی بجائی، ان دونوں کے فرق پر جب غور کرتا ہوں، تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دل خدا کے خوف اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے بالکل خالی ہو چکے ہیں اور انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو کچھ بھی ہے، بس یہی دنیا ہے، آگے کوئی نہیں جہاں اپنے اقوال و اعمال کا انھیں حساب دینا ہوگا۔

میرا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے اور میں آئندہ بھی اسی پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ جن لوگوں کو میں صداقت و دیانت سے بے پروا اور خدا کے خوف سے خالی پاتا ہوں ان کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بدلہ لینا میرے بس میں نہیں ہے، خدا ہی ان سے بدلہ لے سکتا ہے اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ ان کے جھوٹ کی تردید کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ ان کا پردہ ان شاء اللہ دنیا ہی میں فاش ہوگا۔ اس لیے آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں ان کے جواب میں کوئی بیان کسی اخبار کو بھیجوں گا۔“

”میری ذات پر، جو حملے کیے جائیں ان کی مدافعت آپ لوگوں کے ذمے نہیں ہے۔ اگر میرے منع کرنے کے باوجود آپ لوگ اس سے باز نہ رہ سکیں، تو براہِ کرم اس معاملے میں حد اعتدال سے بھی کچھ کم ہی پر اکتفا کریں۔ زیادہ سے زیادہ بس اس قدر کافی ہے کہ اگر کوئی الزام

مجھ پر لگایا جائے یا کوئی علمی اعتراض مجھ پر ہو، تو اپنے علم کی حد تک اس کی تردید کریں، یا مجھ سے اس کی حقیقت پوچھ لیں اور اس کا جواب دے دیں۔ باقی رہی میری تذلیل وتحقیر، تو اس پر میرے کسی دوست یا رفیق کو برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ اسے میں پہلے ہی ہر ایک کے لیے معاف کر چکا ہوں اور ہمارے موجودہ دور کے بزرگانِ دین کے لیے تو وہ آپ سے آپ مباح ہے۔ خواہ اسے کوئی معاف کرے یا نہ کرے۔ وہ چاہے کتنے ہی صریح اور رکیک الفاظ میں دوسروں کو جاہل، احمق، گم راہ اور ہادمِ دین کہہ دیں، قابلِ مواخذہ نہیں، البتہ دوسرا اگر ان کی کسی بڑی سے بڑی غلطی پر بھی ٹوک دے، خواہ کتنے ہی ادب واحترام کے ساتھ ٹوکے۔ وہ تنقیص اور تحمیق کا مجرم ہے۔ اس کا مستقل زخم ان کے شاگردوں اور مریدوں کے دلوں پر لگ جاتا ہے اور مدت العمر رستا رہتا ہے۔ ''یہ عالی ظرف'' لوگ ہیں، ان کی کسی بات پر برا نہ ماننا چاہیے۔''

عنقائے بلند آشیاں

(کسی کام کو تجدیدی کام کہنے سے) یہ لازم نہیں آتا کہ جو تجدیدی کام کرے وہ مجدد کے لقب سے بھی ملقب ہو، صدی کا مجدد ہونا تو اس سے بلند تر بات ہے۔ اینٹیں چن دے وہ انجینئر بھی کہلائے اور انجینئر بھی معمولی نہیں، بلکہ اپنی صدی کا انجینئر؟ اسی طرح کسی کا اپنے کام کو تجدیدی کام یا تجدیدی کوشش کہنا، جب کہ فی الواقع وہ تجدیدِ دینِ حق ہی کی غرض سے یہ کام کر رہا ہو۔ محض ایک امرِ واقع کا اظہار ہے اور اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ مجدد ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور صدی کا مجدد بننا چاہتا ہے۔ کم ظرف لوگ بے شک تھوڑا سا کام کر کے اونچے اونچے دعویٰ کرنے لگتے ہیں، بلکہ کام کا ارادہ ہی دعویٰ کی شکل میں کرتے ہیں، لیکن کسی ذی فہم آدمی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کام کرنے کے بجائے دعویٰ کرے گا۔ تجدیدِ دین کا کام ہندستان میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ خود مولانا (حضرت معترض) کو بھی ہم انھی میں شمار کرتے ہیں۔ میں نے اپنی حد استطاعت تک اس خدمت میں حصہ لینے کی سعی کی ہے اور اب ہم چند خدّام دین ایک جماعت کی صورت میں اس کے لیے کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ جس کے کام میں بھی اتنی برکت دے کہ واقعی اس کے ہاتھوں دین کی تجدید ہو جائے وہی در حقیقت مجدد ہوگا۔ اصل چیز نہ آدمی کا اپنا دعویٰ ہے، نہ دنیا کا کسی کو مجدد کے لقب سے یاد کرنا، بلکہ اصل چیز

آدمی کا ایسی خدمت کر کے اپنے مالک کے حضور پہنچنا ہے کہ وہاں اسے مجدد کا مرتبہ حاصل ہو۔ میں مولانا کے حق میں اسی چیز کی دعا کرتا ہوں اور بہتر ہو کہ وہ بھی ''عنقارابلند است آشیانہ'' کہنے کے بجائے دوسروں کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ ان سے دین کی ایسی کوئی خدمت لے لے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بعض اسلامی الفاظ کو خواہ مخواہ ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی رومی عظمت کی تجدید کا داعیہ لے کر اٹھتا ہے اور رومیت کے پرستار اس کو مرحبا کہتے ہیں۔ کوئی ویدک تہذیب کی تجدید کا عزم لے کر اٹھتا ہے اور ہندوئیت کے پرستار اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔ کوئی یونانی آرٹ کی تجدید کے ارادے سے اٹھتا ہے اور آرٹ کے پرستار اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ کیا ان سب تجدیدوں کے درمیان صرف اللہ کے دین کی تجدید ہی ایک ایسا جرم ہے کہ اس کا نام لیتے ہوئے آدمی شرمائے اور اگر کوئی اس کا خیال ظاہر کر دے تو اللہ کے پرستار اس کے پیچھے تالی پیٹ دیں۔''

فکر و شخصیت

حکیمانہ اسلوبِ تفہیم

''آپ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ میری صحت کے بارے میں بہت متفکر ہیں۔ اس ہمدردی و محبت کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ میری صحت کے معاملے میں ذرا فکر نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل میری صحت جتنی اچھی ہے۔ ایسی صحت تو برسوں سے مجھے نصیب نہ تھی۔ وزن بڑھ گیا ہے، خوراک بڑھ گئی ہے۔ نیند اتنی اچھی آتی ہے کہ گزشتہ پندرہ سال میں اتنی اچھی نیند کبھی نہ آئی تھی۔ دماغی اور جسمانی دونوں طرح کی محنتیں پہلے سے زیادہ کرسکتا ہوں اور پہلے سے بہت کم تھکتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بلامبالغہ آج شاید روئے زمین پر مجھ سے زیادہ مطمئن کوئی آدمی نہیں ہے۔ بال بچوں اور متعلقین کی مجھے فکر نہیں، کیوں کہ اُنھیں خدا کے حوالے کر آیا ہوں۔ قوم کی مجھے کوئی فکر نہیں، کیوں کہ اس معاملے میں خدا کی طرف سے جتنی ذمے داری مجھ پر تھی وہ سب موجودہ حکمراں گروہ نے اپنے ذمے لے لی ہے۔ جماعت اور دعوتِ اسلامی کی مجھے فکر نہیں، کیوں کہ گرفتار ہوتے ہی عنداللہ بری الذمہ ہو چکا ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی سو فیصدی یقین رکھتا ہوں کہ اس کام کو میرے قید ہونے اور رہنے سے قطعاً کوئی نقصان نہ پہنچے گا، بلکہ اس کے برعکس فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس کے بعد آپ خود ہی سوچیں کہ مجھ سے زیادہ خوش و خرم اور مطمئن کون ہوسکتا ہے۔ پھر یہاں غور و فکر اور گہرے مطالعے کا، جو خداداد موقع مجھے مل گیا ہے یہ تو وہ نعمت ہے، جس کے لیے میں اپنی بے حد مصروف زندگی میں مدتوں سے ترس رہا تھا، آج کل اس نعمت سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہوں اور مگن ہوں۔''

''میری میعادِ قید کی توسیع پر آپ نے جو صدمہ کا اظہار فرمایا ہے یہ تو ہر حال میں مخلصانہ محبت کا تقاضا ہے، جو آپ کو میرے ساتھ ہے، لیکن ایک بات اصولی طور پر سمجھ لیجیے کہ جو شخص خدا اور خلق کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھے اور خدا کی راہ میں اس کی خلق کی بھلائی کے لیے کام کرے خدا اس کے ساتھ کبھی برا معاملہ نہیں کرتا اور ظاہر بین آنکھیں، جس چیز کو اس کے حق میں شر سمجھتی ہیں وہ بھی خدا کی طرف سے اس کے حق میں خیر ہوتی ہے۔ یہ بات اگر آپ ذہن نشیں کر لیں گے تو ان شاء اللہ آپ کو بھی وہی طمانیتِ قلب حاصل ہو جائے گی، جو خدا کے فضل سے مجھے حاصل ہے۔ یہ محض خوش عقیدگی کی بات نہیں ہے، بلکہ ایک صریح حقیقت ہے۔ میں جس اصلاح کے لیے کام کر رہا تھا اس کے راستے میں پتھر کے پہاڑ حائل نہیں تھے، بلکہ گندگی و غلاظت کے فلک بوس انبار حائل تھے۔ میں نے تو خدا کی رضا کی خاطر اس گندگی کو صاف کرنے کے لیے قدم اٹھا دیا تھا اور جو غلاظت کے چھینٹے مجھ پر پڑنے شروع ہو گئے تھے، اُن کو صبر کے ساتھ برداشت کر رہا تھا، مگر میرے خدا نے مجھ سے چوہڑوں اور بھنگیوں کا کام لینا پسند نہیں کیا، اس لیے اس نے مجھے ایک گوشۂ عافیت میں لا کر بٹھا دیا اور اب وہ گندگی کے انبار انھی لوگوں کے سروں پر اٹھوا کر پھینکوا رہا ہے، جن کی وہ گندگی ہے۔ یہ کام ابھی ادھورا ہے۔ ابھی ایک ہی انبار صاف ہوا ہے۔ چند انبار ابھی باقی ہیں، بلکہ غلاظت کا اصلی اور سب سے بڑا ڈھیر تو ابھی جوں کا توں رکھا ہے۔ اس لیے میرے باہر آنے کا ابھی کوئی موقع نہیں ہے۔ جس روز یہ کام تکمیل کے قریب ہوگا۔ آپ لوگ ان شاء اللہ مجھے اپنے درمیان پائیں گے۔''

''ہماری توسیعِ نظر بندی پر آپ کا اور دوسرے مخلص احباب کا رنج بھی فطری ہے اور آپ لوگوں کی یہ خواہش بھی اپنی جگہ فطری ہے کہ ہماری اور آپ کی جدائی کا یہ دور ختم ہو، لیکن انسان خواہ جزع فزع کرے یا صبر، بہر حال خدا اپنے قوانین اور اپنے طریقے کسی کی خاطر بدلنے والا نہیں ہے۔ اُسے ہمارا اور ہماری قوم کا اور ہمارے سربراہ کاروں کا بہر حال امتحان لینا ہے اور اسی امتحان پر ہم سب کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے یہ امتحان دینا چاہیے اور اس کا ثبوت دینا چاہیے۔

ہم اپنے عقیدے، نیت اور مقصد میں صالح، صادق اور مضبوط ہیں۔ اس کے ساتھ

ہمیں اپنی قوم کے حق میں بھی دعا کرنی چاہیے کہ وہ آخر کار اپنے آپ کو ایک باشعور اور اصلاح پسند قوم ثابت کرے۔ یہی نہیں، بلکہ جو لوگ جھوٹ، فریب اور ظلم کے ہتھیاروں سے ہمارے خلاف نبرد آزما ہیں، ہمیں اُن کے حق میں بھی دعا کرنی چاہیے کہ ان کا بگاڑ اصلاح پذیر ثابت ہو اور وہ اس راہ سے پلٹ آئیں، جس پر چل کر دوسری قوموں کے شیاطین اپنا انجام دیکھ چکے ہیں۔"

"آپ کے تازہ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کی نظر بندی کی طوالت آپ کو اب بہت زیادہ شاق ہو رہی ہے، لیکن در حقیقت یہ چیز ایسی نہیں ہے، جس پر آپ یا ہمارے دوسرے احباب مضطرب ہوں۔ یہاں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سینکڑوں خدا کے بندے ایسے ہیں، جنھوں نے اپنے نفس کی خاطر چوری، ڈاکے، قتل اور دوسرے جرائم کیے اور ان کی پاداش میں کئی کئی سال کی قیدیں برداشت کر رہے ہیں۔ انتہائی تکلیف کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے لیے نہ یہاں کوئی راحت ہے اور نہ حیاتِ اُخروی کے لیے ہی ان کے پاس کوئی تسلی کا سامان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان یہ سب کچھ چند لمحوں کے عارضی فوائد اور لذتوں کی خاطر برداشت کر جاتا ہے، تو کیا ہم کو یہ زیب دیتا ہے کہ جو کچھ ہم نے اپنے نفس کے لیے نہیں، بلکہ خدا اور اس کے دین کے لیے کیا اور جس پر ہم ابدی زندگی میں اجر پانے کی توقع بھی رکھتے ہیں، اس کی پاداش میں بندوں کی کسی انتقامی کارروائی کو ہم ٹھنڈے دل سے برداشت نہ کریں اور اس ذرا سی اذیت پر جو ہمیں پہنچ رہی ہے مضطرب ہونے لگیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ بندگانِ نفس کی بہ نسبت بندگانِ حق کو اگر دوگنے اور چوگنے مصائب وشدائد سے بھی سابقہ پیش آئے تو ان کی پیشانی پر بل نہ آنا چاہیے۔"

تاریخ کی شہادت

"میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں، جنھوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے، کیوں کہ میدان کے مقابلے سے جی چرانا اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی کی کھلی علامت ہے اور خدا نے اپنی یہ زمین بزدلوں کی فرماں روائی کے لیے نہیں بنائی ہے۔ اسی طرح میرا مطالعہ مجھے یہ بھی بتاتا ہے کہ جن لوگوں کا کاروبار جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل پر چلتا ہے اور جن کے لیے حقیقت وصداقت کا روشنی میں آجانا خطرے کا

حکم رکھتا ہے اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لیے ''سیفٹی'' قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسے اخلاقی بزدلوں کی چوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چولہے پر نہ کبھی چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ یہ چیز عقل کے خلاف ہے۔ قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور ہزار ہا برس کے تاریخی تجربات اس پر شاہد ہیں کہ ان سہاروں پر جینے والے تھوڑی دیر کے لیے چاہے کتنا ہی زور باندھ لیں، بہرحال وہ دیر تک نہیں جی سکتے۔ میں اپنی خاطر نہیں خود ان لوگوں کی خاطر ہی یہ چاہتا تھا کہ یہ ہوش کے ناخن لیں اور سیدھے سیدھے بھلے آدمیوں کی طرح کام کریں۔ اس لیے میں نے باہر بھی انھیں سمجھانے کی کوشش کی اور اب اندر سے بھی اتمامِ حجت کر دیا۔ اب اگر یہ دنیا کی ہزاروں مرتبہ آزمائی ہوئی حماقتوں کا تجربہ کرنے ہی پر مصر ہیں تو انھیں تجربہ کر لینے دو۔''

علمی تنقید کا مطالبہ

''جن حضرات علماء نے میرے رسالہ دینیات پر فتوے تحریر فرمائے ہیں، میں شخصی طور پر بھی ان کا نیاز مند ہوں اور ان کے علم و فضل کا بھی احترام میرے دل میں ہے۔ ان تک میری یہ گزارش پہنچا دی جائے کہ فتوے تحریر فرمانے اور انھیں اہلِ فتنہ کے ہاتھ میں دینے کے بجائے وہ براہِ کرم میری کتابوں پر علمی تنقید فرمائیں۔ مجھے اپنی کسی غلطی کو غلطی ماننے میں اور اُس کی اصلاح کرنے میں نہ پہلے کبھی تامل تھا اور نہ اب ہے، البتہ پہلے بھی یہ عرض کرتا رہا ہوں اور اب بھی اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جس چیز کو غلطی کہا جاتا ہے، اُسے تعین کے ساتھ مجھے بتایا جائے، تاکہ میں اس کی اصلاح کر سکوں۔ مبہم اعتراضات سے یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ چیز کیا ہے، جس پر اعتراض ہے۔''

''آپ میں سے بعض لوگ ''حق'' کی عقیدت سے کچھ بڑھ کر ''رجال'' کی عقیدت میں مبتلا ہیں، میں آپ کو ثابت شدہ واقعات سنا رہا ہوں کہ اشتراکی کارکنوں کے ساتھ روسی ترکستان کے علماء نے ابتداءً، جو تعاون کیا تھا اُس کا خمیازہ کس بری طرح سے اُنھوں نے بھگتا اور اس کے نتیجے میں کس طرح اسلام اس سرزمین میں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا، جو بارہ سو برس تک قبۂ اسلام بنی رہی تھی۔ اس کے ساتھ میں آپ کے سامنے یہ واقعات بھی پیش کر رہا ہوں کہ

بعض اچھے خاصے ذمے دار علماء ہندستان بھی کس طرح اسی غلطی کا اعادہ کر رہے ہیں۔ آپ میری ان دونوں باتوں میں سے کسی کی بھی تردید نہیں کرتے اور نہیں کر سکتے، لیکن پھر بھی آپ کو شکایت اُن حضرات سے نہیں ہے، جو اسلام کے لیے اپنی نادانی سے یہ خطرہ پیدا کر رہے ہیں، بلکہ آپ کو اُلٹی شکایت اس شخص سے ہے، جو اس نادانی پر ان کو خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی جڑوں پر تیشہ چل جانے سے آپ کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی، جتنی اپنی عقیدت کے بتوں کو ٹھیس لگنے سے ہوتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔"

نفسی کیفیتوں کی نبّاضی

"آپ کے عنایت نامے سے ان اسباب کا سراغ ملا، جن کی وجہ سے دیوبند اور سہارن پور سے لے کر مدرسہ امینیہ تک یکا یک یہ طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ممکن ہے اسباب کچھ اور بھی ہوں، لیکن ایک قریبی سبب آپ کا (اور شاید آپ جیسے بعض اور لوگوں کا بھی) وہ بے جا جوشِ تبلیغ ہے، جس سے مغلوب ہو کر آپ نے بہ طور خود درس و افتاء اور مذہبی پیشوائی کے بڑے بڑے مسند نشینوں کو جماعت اسلامی اور اس کی تحریک کی طرف دعوت دے ڈالی، حالاں کہ اس سے بارہا منع کیا جا چکا تھا۔ بعید نہیں کہ آپ کی طرح کے بعض جوشیلے حضرات نے ان دینی مراکز کے گرد و پیش کی دنیا میں بھی پہنچ کر کچھ تبلیغی سرگرمیاں دکھائی ہوں اور وہ ان حضرات کے بھڑک اُٹھنے کی موجب بن گئی ہوں۔ آپ تقسیمِ ہند کے پہلے کی رودادیں اُٹھا کر دیکھ لیجیے، ان میں جگہ جگہ یہ چیز آپ کو ملے گی کہ لوگوں نے بار بار اکابر علماء کو دعوت دینے پر اصرار کیا ہے اور میں نے ہمیشہ نہ صرف خود اس سے پہلو تہی کی ہے، بلکہ جماعت کے عام ارکان کو بھی (بجز اُن لوگوں کے، جو خود اس کوچے سے تعلق رکھتے ہوں) تاکید کی ہے۔ دعوت کی غرض سے علماء کے پاس جانا تو درکنار اُن کے قریب تک نہ پھٹکیں، مگر افسوس ہے کہ لوگوں نے میرے اس انکار اور مخالفت کے راز کو نہ سمجھا اور آخر کار اس کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ بعض لوگوں نے مجھ پر اُلٹی یہ بدگمانی بھی کی کہ میں نخوت اور تکبر کی بنا پر مذہبی آستانوں کی حاضری سے انکار کرتا ہوں۔ حالاں کہ میرا حال یہ ہے کہ میں اپنے اس نصب العین کی خاطر "کوچۂ رقیب" میں بھی سر کے بل جانے کے لیے تیار ہوں اور ان شاء اللہ ہمیشہ تیار رہوں گا۔ ان آستانوں سے میرے گریز اور دوسروں کو بغرض

دعوت اُن کے پاس جانے سے منع کرنے کی وجہ ہرگز وہ نہ تھی، جو لوگوں نے بدگمانی کی بنا پر سمجھی، بلکہ ایک دینی مصلحت تھی، جس کو میں اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بنا پر ایک مدت سے خوب سمجھ چکا تھا۔''

''مجھے ہر کلمۂ تحسین سے بالکل معاف رکھیے۔ آپ لوگ تو ایک آدھ لفظ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں اور مجھے مدتوں اس کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے سر کی ٹوپی تک بچانی مشکل ہو جاتی ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مذہبی دنیا میں ''ساری حمد واسطے ان حضرات کے'' ہے۔ بے دین سیاست کے لیڈروں کی حمد و ثنا جتنی بھی ہو جائے مضائقہ نہیں، بلکہ ان میں سے کوئی بہت زیادہ مقبول ہو جائے، تو وہ ان حضرات کی زبانوں سے بھی مبالغہ آمیز حمد کا مستحق ہو جاتا ہے، لیکن دین کی راہ سے، جو شخص آئے اور ان آستانوں کا پروانہ لے کر نہ آئے، اس کے حق میں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کلمۂ تعریف بھی ان کے دلوں پر تیر کا سا کام کرتا ہے۔ ان کی اس کم زوری کا لحاظ کر کے اگر آپ لوگ اس طرح کے کلمات زبان سے نکالنے بند کر دیں، تو یہ میرے حق میں بھی بہتر ہے اور اس تحریک کے حق میں بھی۔ میں خدا کے فضل سے کسی تعریف کا حاجت مند نہیں ہوں، جو کچھ کر رہا ہوں، اپنے اندرونی احساسِ فرض کی بنا پر کر رہا ہوں۔ لوگوں کی تعریف کے بغیر، بلکہ مذمت کے باوجود، ان شاء اللہ اپنا کام اسی طرح کرتا رہوں گا۔''

اے مریض اپنا علاج کر!

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اوپر آپ تنقید کرنا اور اپنی کم زوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آئند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس چیز کو خوش آئند سمجھ کر نہیں کرتا، بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے، جسے حلق سے اتارتا ہوں اور اچھی طرح سے اس تلخی کو محسوس کرتا ہوں، جو میرے دوسرے بھائی اس کے اندر پاتے ہوں گے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیے۔ تلخی تو واقعی میں موجود ہے۔ تغافل کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک سے معطل کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کم زوریوں اور غلطیوں سے نہ صرف غفلت برتنا،

بلکہ ان کے لیے جواز واستحسان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوش گوار چیز ہے۔ جس سے دل خوب بہلتا ہے مگر اس کی حیثیت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پینک ہے، جس کے نشے میں مریض سو جاتا ہے، مگر وہ اندرونی خرابیاں دور نہیں ہوتیں، جن کے سبب سے بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی انھیں اسی پینک کی خوراکیں دیا کروں۔ ان کی خواہش ہے کہ جس خیالی جنت میں وہ جی رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ آبِ حیوان پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں اور جن غلط فہمیوں کا دل فریب طلسم انھوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں، بلکہ اگر ہو سکے، تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں، جن کے لیے ان چیزوں کا سراہنا دین اور اُمت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔ ع

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی!
